شخصیات اور واقعات
جنہوں نے
مجھے متاثر کیا

شخصیات اور واقعات

جنھوں نے مجھے متاثر کیا

UQAAB
03055193533

جملہ حقوق ہندوستان اور پاکستان کے لئے محفوظ ہیں

اشاعت اول

قیمت :- پانچ روپے

ملنے کا پتہ

جنید بک ہاؤس

۵۵ - مورلینڈ روڈ بمبئی ۸

شیریں تر از حکایتِ ما نیست قصۂ
تاریخِ روزگار تمنا نوشتہ ایم

اس کتابچہ کے مضامین اس سے پہلے کہیں شائع
نہیں ہوئے

پرنٹر:۔ اے۔ کے۔ محمد نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبے ۳
میں چھاپا اور جنید احمد نے ۶۳ مورلینڈ روڈ بمبے ۸ سے شائع کیا

ترتیب

رشید احمد صدیقی ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ نوح ناروی ۔ فیض احمد فیض ۔
اثر لکھنوی ، مخدوم محی الدین ، ڈاکٹر سید محمود ۔ فراق گورکھپوری
راجیندر سنگھ بیدی ۔ عبدالرحمن چغتائی ۔ لطیف الدین احمد ،
آل احمد سرور ، ڈاکٹر محمد اشرف ، پنڈت سندر لال ،
نیاز فتحپوری ، سجاد ظہیر ، کرشن چندر ، خواجہ احمد عباس
عبد الماجد دریابادی ، سردار جعفری

حرف آغاز

نئی نسل کی ذہنی تشکیل کے ذمہ دار وہ دانش ور بھی ہیں جن کی علمی اور ادبی تحریریں ہم ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور وہ مدبر بھی جو نئے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

یہ جاننے کی خواہش بڑی فطری ہے کہ خود ان لوگوں کی ذہنی تشکیل میں کن عناصر اور کیسے کیسے حالات نے حصہ لیا ہے۔ خود ان کی زندگی میں وہ شخصیتیں آچکی ہیں جو ان کے دل و دماغ پر لافانی نقوش چھوڑ گئی ہیں۔ وہ کیسی شخصیتیں تھیں اس کا جواب مختلف اہل علم اور اہل قلم حضرات نے ان مضامین میں دیا ہے جو آپ کے سامنے اس کتاب کی شکل میں آرہے ہیں۔

لکھنے والوں میں پرانی وضع کے بزرگ بھی ہیں اور نئے طرز فکر کے علمبردار بھی۔ اور کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جنہوں نے جدید و قدیم کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ مضامین صرف تنوع نہیں بلکہ دلچسپ اور بصیرت افروز بھی ہیں۔ ان میں نہ صرف عظیم واقعات اور حادثات اور عظیم شخصیات کا ذکر ہے۔ بلکہ زندگی کے بعض بہت چھوٹے چھوٹے واقعات اور نہایت حقیر لوگوں کا تذکرہ بھی ہے۔ ان چھوٹوں اور حقیروں نے جس طرح آج کے بڑوں کو متاثر کیا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ زندگی میں چھوٹے اور بڑے کی تقسیم کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ انتہائی حقیر چیزیں بھی انتہائی اہم ہوتی ہیں۔ اور اس حقیقت کی گواہی ہمارے یہ ہر دلعزیز ادیب اور مدیر خود ہیں آج جن کے علم و فن کا اعتراف دوسرے ممالک میں بھی کیا جا رہا ہے۔

اس مجموعے کے آخر میں بعض خطوط بھی شامل ہیں جو اس مجموعے کی ترتیب کے دوران موصول ہوئے ہیں۔ ان سے بھی لکھنے والوں کے خدو خال ابھرتے ہیں۔ الفاظ کے پردوں میں معنی کے ساتھ لکھنے والوں کی دلآویز صورتیں بھی ہیں۔

میں ان تمام حضرات کا شکر گذار ہوں جن کے تعاون نے اس کتاب کی شکل اختیار کی ہے۔ اردو میں یہ پہلا تجربہ ہے۔ اس کی کامیابی پر ایسے ہی دوسرے مجموعے بھی پیش کئے جائیں گے۔

جنید احمد
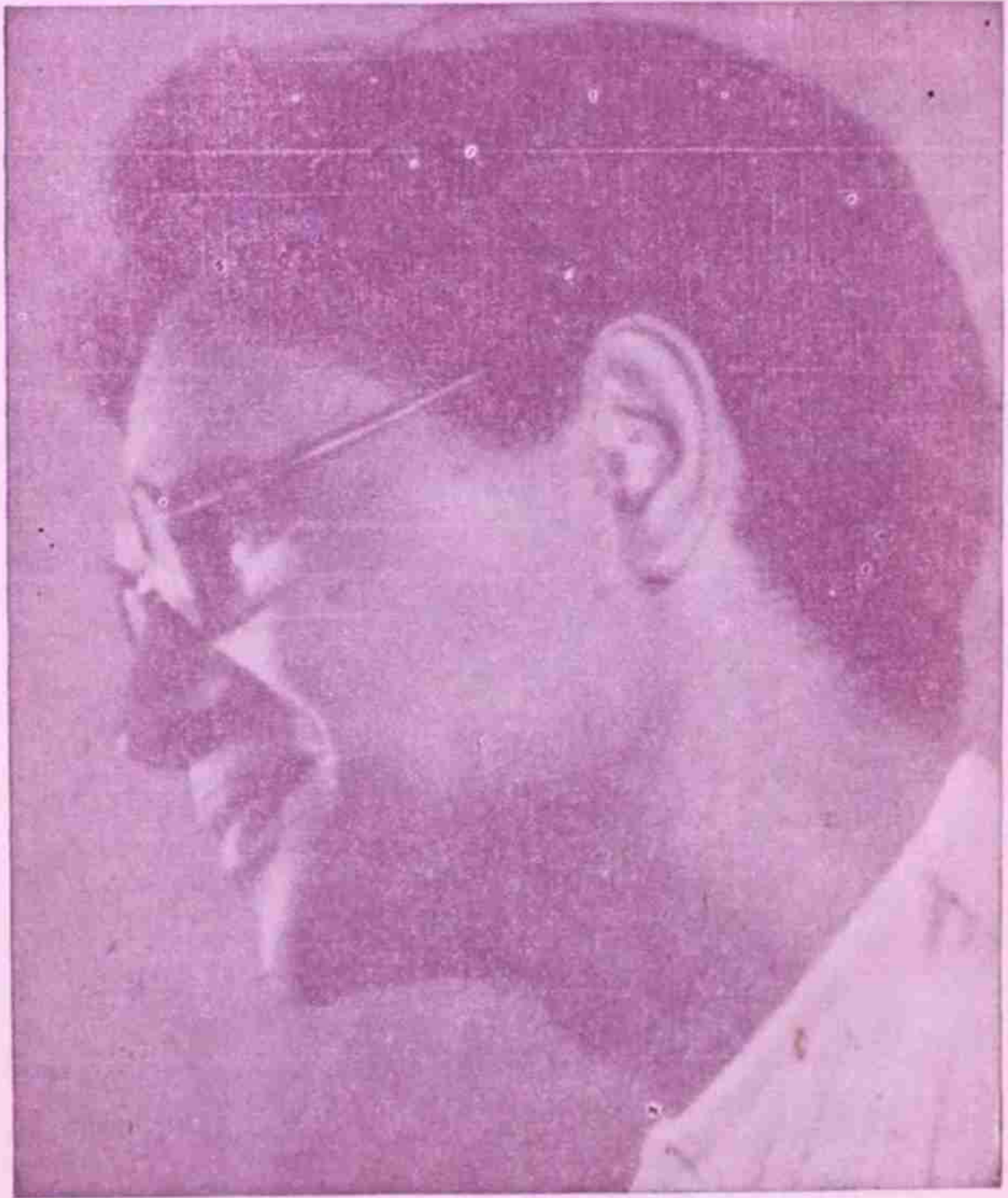
ڈاکٹر محمد اشرف

سجاد ظہیر
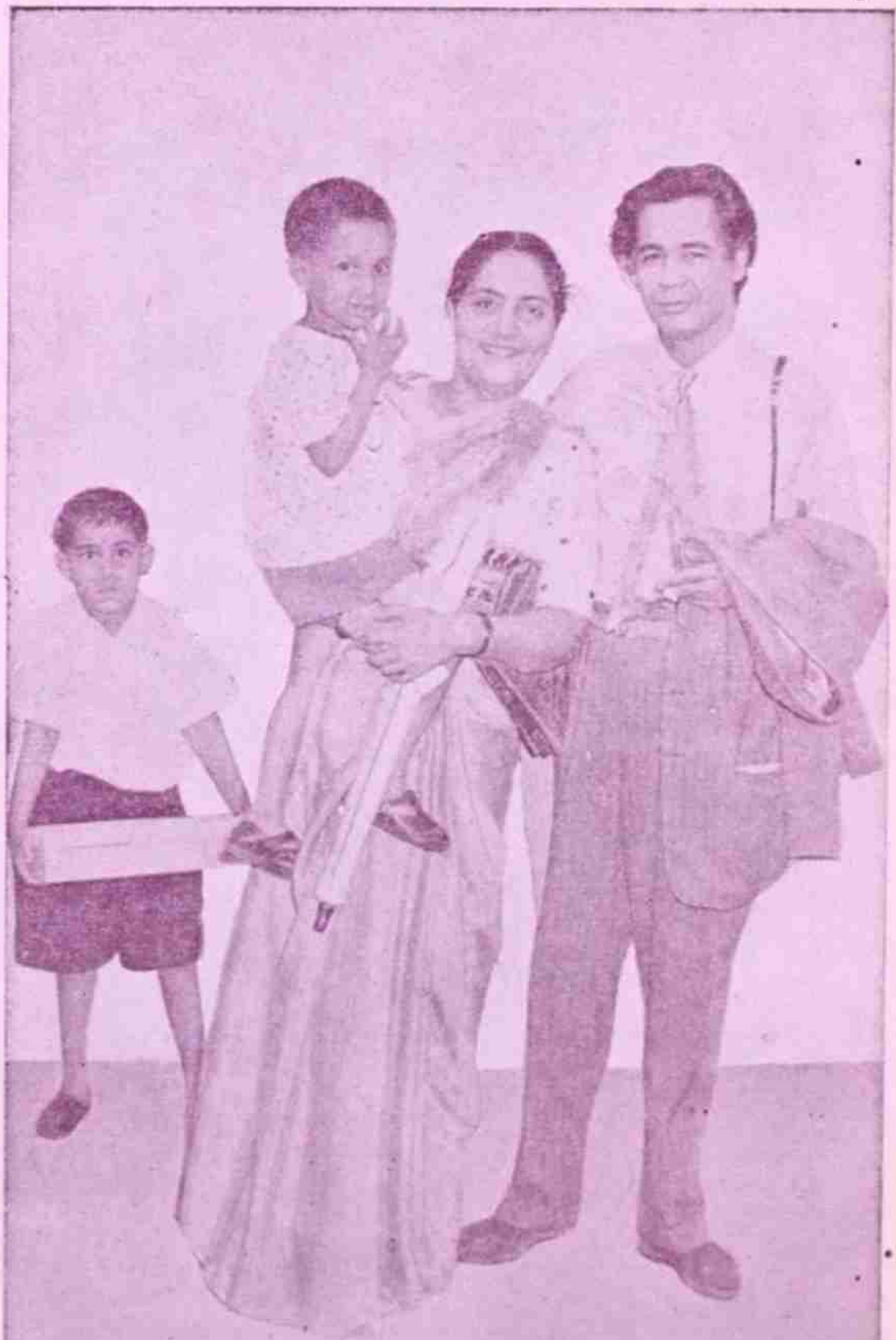
سردار جعفری، بیگم جعفری اور اُن کے بچے

آل احمد سرور

راستہ چلنا آسان ہوتا ہے مگر چلتے چلتے اپنا جائزہ لینا اور اپنے سفر پر حکم لگانا مشکل
ہے۔ خود اپنے پر تنقیدی نظر ڈالنا، ان اثرات کا پتہ چلانا جو شخصیت کے بننے میں معاون
ہوئے ہیں، ان اشخاص کی سیرت کے اہم نقوش کو ذہن میں تازہ کرنا، جن سے خود
اپنا نقش بنا ہے، ان واقعات کا تجزیہ کرنا جنھوں نے کسی نہ کسی طرح سیرت، کردار،
مزاج، طبیعت کو آب و رنگ دیا ہے، غرض اپنے کو اپنے محرکات سے پہچاننا ایک جوئے
شیر لانے سے کم نہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اثرات تو نظر میں ہوں جو سامنے سے آئے
ہیں مگر جو چور دروازے سے داخل ہوگئے ہیں ان کی مجھے خبر نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ
میں چاند سورج کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں اور ان ستاروں کی مجھے خبر نہ

ہو جن کی مدھم اور خنک روشنی میری شخصیت میں نفوذ کر رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں برق و رعد کے جلال سے متاثر ہو رہا ہوں اور سرمئی شامیں اور کہر میں لپٹی ہوئی صبحیں سب مجھے یاد نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی خاص لمحہ اس طرح تجلی بن کر میرے سامنے آیا ہو کہ کائنات ایک نوریں غبار میں اٹی ہو اور اب اس نوریں غبار کی ایک دھندلی سی یاد ہی رہ گئی ہو۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ کوئی بادل کا ٹکڑا بار بار اس طرح سامنے آجاتا ہو کہ اس سے بے رحم حقیقت کی کرنیں ایک دلفریب دھندلکے میں چھپ چھپ جاتی ہوں اور وہ دھندلکا بھی تحریر بن گیا ہو۔

میرا حال اس مسافر کا ہے جسے یاد نہیں کہ وہ کس منزل کی جستجو میں روانہ ہوا تھا اور کب، ہاں ایک اضطراب مسلسل اور ایک مبہم خلش کا احساس ضرور ہے۔ اپنے سفر کی ابتدا کو یاد کرتا ہوں تو مشہور امریکن شاعر رابرٹ فراسٹ کی یہ سطریں ذہن میں آجاتی ہیں،

Somewhere, ages and ages hence
Two roads diverged in a wood, and I
Took the one less travelled by
And that has made all the diffe-
rence.

پہلے میں اپنا مختصر تعارف کرا دوں اور ان اثرات کا تذکرہ کر دوں جو بچپن میں پڑے بچپن کے یہ اثرات میرے ذہن میں گڈمڈ سے ہیں۔ مگر یہ احساس ضرور ہے کہ ان کا میری شخصیت کی تعمیر میں حصہ ضرور رہے اور انھیں کی وجہ سے میں بعد میں بعض چیزوں سے

زیادہ اور بعض سے کم متاثر ہوا۔ میں بدایوں کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوا۔
پیدائش کا سال ستمبر ۱۹۱۱ء ہے۔ میرے والد ڈاک خانے میں ملازم تھے اور باہر
رہتے تھے۔ میری والدہ زیادہ تر میکے میں رہتی تھیں۔ میں زیادہ تر ننھیال میں اور کبھی
کبھار ددھیال میں رہتا تھا۔ پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ مولانا عبدالماجد
بدایونی نے بسم اللہ پڑھائی۔ اپنے ایک ماموں کے مکتب میں میں نے اردو اور
قرآن شریف شروع کیا۔ مولانا صاحب بزرگوں کے قصے سنایا کرتے تھے۔ گھر کی بڑی
بوڑھیاں کہانیاں سناتی تھیں۔ ہمارے گھر میں بیت بازی کا بہت رواج تھا،
جس میں گھر کی عورتیں اور بچے سب ہی حصہ لیتے تھے۔ بدایوں میں بزرگوں کے
عرس بہت ہوتے اور میں بھی بڑوں کے ساتھ جایا کرتا۔ ان عرسوں میں مولویوں کے
وعظ دلچسپ معلوم ہوتے مگر ان سے زیادہ دلچسپی نعت و منقبت میں ہوتی، میں ہم عمروں
کے کھیلوں، اونچا نیچا، گلی ڈنڈا اور کبھی کبھی جرمنی اور انگلستان کی لڑائی میں شریک
ہوتا۔ مگر زیادہ دلچسپی بڑوں کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سننے میں تھی۔ پڑوس
میں ایک پرانے زمیندار مولوی عطا احمد تھے جو ہمارے دور کے عزیز بھی تھے۔
یہ بزرگوں کی شان میں قصیدے لکھتے، روز کچہری جاتے اور گاؤں کے پھیرے
کرتے رہتے تھے۔ شام کو دوستوں کے مجمع میں اپنے قصیدے سنایا کرتے،
کبھی کبھار شعراء پر تنقید بھی ہوتی۔ مجھے ان سب باتوں سے بڑی دلچسپی تھی،
سیکڑوں شعر یاد ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں بدایوں میں خلافت کی تحریک کا
بڑا زور تھا۔ جامع مسجد میں روز جلسے ہوتے، شہر میں لیڈروں کے جلوس

نکلتے، ان جلسوں میں میں ضرور شریک ہوتا۔ ایک دفعہ ایک دوست کے ساتھ عورتوں سے ایک ایک پیسہ چندہ کر کے ایک روپیہ جمع کیا اور محلّے کے کارکن کو دے دیا۔ کتنی ہی نظمیں یاد کر لی تھیں۔ غرض عجیب زمانہ تھا۔ میں نے اردو پڑھنے کے بعد فارسی شروع کی۔ مگر گلستاں کے چند باب پڑھ پایا تھا کہ انگریزی کی طرف موڑ دیا گیا۔ اور کنگ ریڈر شروع کرا دی گئی۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھنے کا شوق بہت چھوٹی عمر میں شروع ہو گیا تھا۔ آٹھ نو سال کی عمر میں میرا نام پیلی بھیت کے انگریزی اسکول میں لکھا دیا گیا۔ اب ہمارا سارا گھر پیلی بھیت منتقل ہو گیا تھا۔ اس وقت ہم چار بہن بھائی تھے۔ والد کو دفتر سے اور والدہ کو گھر سے فرصت نہ ملتی، بڑے بھائی بہن مجھ سے بہت بڑے تھے۔ چنانچہ میں اپنا وقت دفتر کے کلرکوں، چپراسیوں اور کبھی کبھار والد کے ملنے والوں کے ساتھ گذارا کرتا۔ اس زمانے میں والد رات کو اردو یا انگریزی کی کوئی کتاب ضرور پڑھتے تھے۔ میں بھی چوری چھپے اُسے ضرور پڑھا کرتا۔ اس پر پٹا بھی مگر یہ عادت گئی نہیں۔ جب میں پانچویں درجے میں تھا اور امتحان سر پر تھا تو میں ایک دن فسانۂ آزاد پڑھتے ہوئے پکڑا گیا۔ خوب مرمت ہوئی۔ والد نے بہت ڈانٹا کہ امتحان سر پر ہے اور یوں وقت خراب کیا جا رہا ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ جو چیز ایک دفعہ کلاس میں پڑھ لی ہے اور یاد ہو گئی ہے اُسے پھر کس طرح پڑھا جائے۔ ایک دفعہ سنیچر کے دن ایک ماسٹر نے کہا کہ پیر کو آموختہ سنا جائے گا۔ اور پورا سبق دو دفعہ پڑھ لیا جائے۔ پیر کو امتحان ہوا میں نے ہر سوال کا تسلی بخش جواب

دیا۔ پوچھنے پر بتایا کہ ایک دفعہ سبق پڑھا تھا۔ ماسٹر نے اس بات پر مارا کہ جب دو دفعہ پڑھنے کو کہا تھا تو ایک دفعہ کیوں پڑھا۔ لطف یہ تھا کہ ایک دفعہ بھی نہیں پڑھا تھا اور ڈر کے مارے جھوٹ بولا مگر پٹائی سے نہ بچ سکا۔ یاد پڑتا ہے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں مراۃ العروس، توبۃ النصوح، الف لیلہ اور اس قسم کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں طلسم ہوش ربا کی کئی جلدیں اور تاریخ ابن خلدون کے کئی حصے مل گئے۔ میرا برا حال تھا، کبھی ایک کو صبح سے دوپہر تک پڑھتا تھا، کبھی دوپہر سے شام تک دوسری کو، کچھ سمجھتا تھا کچھ نہیں، مگر پڑھ سب جاتا تھا۔ پانچویں درجے سے کچھ ایسا اتفاق ہوتا کہ اسکول ڈاک خانے سے ڈیڑھ دو میل دور ہوتا۔ میں پیدل جایا کرتا۔ کبھی کوئی ساتھ ہوتا کبھی نہیں۔ گھر سے نکلا اور خیالی پلاؤ پکانا شروع کیا۔ کبھی بادشاہ بنتا کبھی سپہ سالار، کبھی باغی، کبھی مصنف، اس طرح بغیر فاصلے کی دوری یا دھوپ کی تمازت محسوس کئے، اسکول یا گھر پہنچ جاتا۔ خیالی پلاؤ پکانے کی یہ عادت اب کم ہوگئی ہے۔ مگر چھوٹی نہیں، لطف یہ ہے کہ ایک ذہنی تصویر سے طبیعت اکتائی اُسے ہٹاکر دوسری بنانی شروع کردی۔

کلاس میں ہر مضمون میں ہمیشہ اچھا رہا سوائے حساب کے جو کبھی قابل اطمینان نہ ہوا۔ ساتویں، آٹھویں درجے ہی میں، میں اردو خاصی لکھ لیتا تھا۔ شعر بھی موزوں کرلیتا تھا۔ انگریزی اخبار کے مطالعے کا شوق ہوچکا تھا۔ اردو میں اخبار مدینہ برابر پڑھا کرتا، بانگ درا کی بہت سی نظمیں یاد تھیں۔ فانی کی غزلیں جھوم جھوم کر پڑھا کرتا تھا۔ جلسوں میں شرکت ضرور کرتا تھا۔ کوئی قومی رہنما شہر میں آتا تو اسکی

تقریر سننے ضرور جاتا۔ آٹھویں درجے میں تھا کہ علی گڑھ میں پچاس سالہ جوبلی کی تقریب ہوئی۔ والد کی خوشامد کر کے ان کے دوستوں کے ساتھ غازی پور سے علی گڑھ آیا۔ افتتاحی اجلاس کی شان و شوکت، سیدین صاحب کی ایک مباحثے میں تقریر، مشاعرے کا منظر آج تک یاد ہیں۔

اسکول کا زمانہ زیادہ تر سیتاپور، گونڈے اور غازی پور میں گذرا۔ یو پی کے ان اضلاع میں مسلمان طلبہ کلاس میں کم ہوتے تھے۔ اور استاد خال خال۔ مگر مجھے استادوں کی شفقت اور ساتھیوں کی محبت ہمیشہ ملی۔ باپ قوم پرست خیالات رکھتے تھے۔ میرے ایک استاد ماسٹر رام ناتھ مجھ پر اس طرح مہربان تھے کہ دوسرے طالب علم رشک کرتے تھے۔ چنانچہ تنگ نظری اور تعصب مجھ میں کسی زمانے میں پیدا نہ ہوا۔ ہائی اسکول میں ایک دفعہ اپنی مرضی کے خلاف ساتھیوں کے کہنے سے اسٹرائک کر دی اور امتحان کے کمرے سے باہر آگیا۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر جو بہت مہربان تھے سخت ناراض ہوئے۔ میں چونکہ کلاس میں سب سے تیز تھا اس لئے سب کا لیڈر تھا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے تک ہمارے جلسے ہوتے رہے۔ میں باقاعدہ انگریزی میں جلسوں کی روداد یں لکھتا تھا۔ اور تقریریں کرتا تھا۔ امتحان کی قربت کی وجہ سے سارا معاملہ جلد ٹھنڈا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر پھر مہربان ہو گئے۔

ماسٹر رام ناتھ کی شفقت و محبت آج تک یاد ہے۔ یہ ایسی اچھی انگریزی بولتے تھے کہ پروفیسر کہلاتے تھے، کھیل کود سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ کرکٹ بہت اچھی کھیلتے تھے، میں صرف تماشائی تھا۔ کہتے تھے کہ مجھے گرامر نہیں آتی، اور اسکی ضرورت بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ میری گرامر سے بے پروائی شاید انھیں کے اثر کا نتیجہ ہو۔

ماسٹر رام ناتھ مندروں کی کچھ رسموں پر اکثر اعتراض کرتے تھے۔ انگریزوں کے بہت دلدادہ تھے۔ وہ مسلمانوں کی بعض باتوں سے بھی متاثر تھے۔ غرض بڑے وسیع، القلب اور رواداری آدمی تھے۔ میری شخصیت کی تعمیر میں ان کا خاموش اثر ضرور رہا۔

ہائی اسکول کا امتحان میں نے بنارس سے دیا۔ چند دوست ساتھ تھے۔ دن بھر ہم لوگ پڑھتے۔ شام کو بنارس کے گھاٹوں اور گلی کوچوں کی سیر کرتے۔ ہائی اسکول تک میں نے انگریزی کی بہت سی مستند ناولیں پڑھ ڈالی تھیں۔ معلومات عامہ کے لحاظ سے بھی کسی سے کم نہ تھا۔ سیاسی مسائل پر بڑے جوش سے اظہار خیال کرتا۔ موتی لال نہرو کی پارلیمنٹ میں تقریریں بڑے غور سے پڑھا کرتا۔ ایک تقریر کے آخری جملے جو غالباً ۱۹۲۸ء میں ہوئی تھی، اب تک یاد ہیں۔ کسی نے طعنہ دیا تھا۔ کہ کانگریس آزادی کے لئے قربانی نہیں دینا چاہتی۔ یہ تو اقتدار اور عہدے چاہتی ہے۔ اس پر انہوں نے کہا تھا،

"Our ambition, our highest ambition is to be buried in the foundation of a Free India, to be buried there & to be there, but with the satisfaction that the noble edifice of India's freedom, shall rise on our bones."

ہائی اسکول میں پرچے اچھے ہوئے تھے۔ مگر حساب میں واجبی ہونے کی وجہ

سے سکنڈ کلاس ملا۔ اس کے بعد چچا کے پاس آگرے بھیج دیا گیا۔ یہاں سینٹ جانس کالج میں فرسٹ ایر سائنس میں نام لکھایا گیا، والدین کا خیال تھا کہ "ڈاکٹری سیکھائیں"۔ مجھے سائنس سے دلچسپی نہ تھی مگر بغاوت کی بھی ہمت نہ تھی۔ انگریزی اور اردو ادب اور معلومات عامہ کی کتابیں پڑھا کرتا مگر سائنس کا اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ہر طالب علم کو عہد نامہ جدید کا ایک نسخہ کالج کی طرف سے دیا گیا۔ میں نے اُسے پڑھنا شروع کیا اور اسکی زبان سے بہت متاثر ہوا۔ کچھ مسلمان دوستوں کو میرا انجیل سے یہ شغف گوارا نہ ہوا، اور انھوں نے کتاب غائب کر دی۔ کالج کی یونین میں، سائنٹفک سوسائٹی میں' اور اردو سوسائٹی میں برابر شریک ہوتا رہا۔ تقریر کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔ مجمع کے سامنے جانے میں مجھے ہمیشہ گھبراہٹ معلوم ہوتی مگر اس گھبراہٹ پر قابو پانے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا۔ کالج میگزین میں میری غزلیں، نظمیں اور مضامین شائع ہوتے' تین استادوں سے میں اس زمانے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ایک کیمسٹری کے استاد امتانی تھے۔ بڑے قوم پرست، معلم اخلاق اور دلنواز شخصیت کے مالک' وہ کیمسٹری کم پڑھاتے تھے؛ علمی، تہذیبی اور قومی آداب پر زیادہ زور دیتے۔ یہ گجراتی تھے۔ دوسرے اسنیل انگریز تھے۔ یہ بھی کیمسٹری پڑھاتے تھے، نوجوان آدمی تھے' سیمابی فطرت رکھتے تھے۔ کلاس میں دوڑتے ہوئے داخل ہوتے' اکثر گھر پر بلایا کرتے۔ ان کی وجہ سے مجھے نامیاتی کیمیا سے دلچسپی ہو گئی تیسرے رلفورڈ' لمبے تڑنگے' بال آرائش سے بے نیاز' فلسفے کے استاد، مگر ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے' ان سے ربط ضبط اس لئے بڑھا کہ میں انگریزی میں مضمون لکھتا تھا' اور یہ کالج میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ سائنس کے طالب علم انگریزی

میں نیاز مند اور معلومات عامہ میں کورے سمجھے جاتے تھے۔ میں فرسٹ ایر میں آرٹس، سائنس، کامرس میں انگریزی میں فرسٹ آیا۔ اور معلومات عامہ میں آرٹس، سائنس کامرس میں فرسٹ ایر سے فورتھ ایر تک سب سے زیادہ نمبر پائے۔ ہمارے ڈین فیکلٹی آف سائنس ڈاکٹر پانڈیا خوشی کے مارے اتنے بے حال ہوئے کہ کالج اسٹاف کی میٹنگ میں آرٹس اور کالج کے اساتذہ کو طعنے دینے لگے۔ اس زمانے میں، میں نے ہارڈی کے بہت سے ناول پڑھے اور اب تک یاد ہے کہ JUDE THE OBSCURE پڑھ کر بے اختیار رونے لگا۔ ایف، ایس، سی میں سکنڈ کلاس ملا تو میں نے چاہا کہ آرٹس لے لوں۔ مگر والد نے بی، ایس، سی کرنے کا مشورہ دیا۔ مسٹر مہاجن جو کالج میں انگریزی کے شعبے کے صدر تھے، چاہتے تھے کہ میں آرٹس لے لوں۔ مگر والد اور چچا کی مرضی کے خلاف کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ میں تھرڈ ایر میں تھا کہ نمک کی ساگرہ اور سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ گاندھی جی آگرے آئے، انھیں دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ مگر ان کی تقریر سن کر بڑی مایوسی ہوئی اس زمانے میں، میں تقریر میں خطابت کی آن بان ڈھونڈھتا تھا۔ گاندھی جی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بول رہے تھے۔ کچھ دنوں کالج سول نافرمانی کی وجہ سے بند ہو گیا۔ میں ہر جلسے میں شریک ہوتا۔ ان چیزوں سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ مگر کوئی عملی قدم اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ تھرڈ ایر میں، میں ہوسٹل میں آگیا تھا۔ کچھ دن دوستوں کے ساتھ انگریزی تصویریں دیکھنے میں گذارے۔ دن بھر کالج کی دلچسپیوں میں گذرتا۔ رات کو کھانے کے بعد پڑھا کرتا۔ دیر تک جاگنے اور دیر سے اُٹھنے کی عادت اس زمانے میں پڑی جو اب تک نہیں گئی۔ کالج کے زمانے میں

سرت اور شتی سے دوستی ہوئی جو ادارے کے بہترین طالب علم تھے، دونوں اب سرکاری افسر ہیں۔ مجاز اور جذبی سے بھی اس زمانے میں ملاقات ہوئی۔ تھرڈ ایر میں، میں نے جنرل سکریٹری کے عہدے کے لئے امیدوار ہوا۔ اور ایک بہت معمولی ہندو طالب علم کے مقابلے میں ہار گیا۔ فورتھ ایر میں لٹریری سکریٹری کے عہدے کے لئے کھڑا ہوا اور چند ووٹوں سے پھر ہار گیا۔ فرقہ پرستی کے اس مظاہرے سے رنج ہوا۔ مگر میرے خیالات نہ بدلے۔

بی، ایس، سی میں تھیوری میں فرسٹ کلاس نمبر آئے مگر پریکٹیکل میں کم آنے سے کچھ نمبر سے فرسٹ کلاس رہ گیا، تو سائنس چھوڑنے کا قطعی ارادہ کر لیا اور علی گڑھ پہونچ کر انگریزی میں ایم، اے کا داخلہ لیا۔ علی گڑھ کا مجھ پر بڑا اثر ہے۔ مگر میرے کردار اور اقدار کی تشکیل میں سینٹ جانس کالج کا اثر بھی کم نہیں، اس نے مجھے تمام مذاہب کا احترام سکھایا۔ اس نے میرے ذہن کو رواداری، اخلاق، درد قومی سے آشنا کیا۔ یہاں بھی مجھے ایسے استاد ملے جو علم سے لگن اور طلبہ سے محبت رکھتے تھے، اور ہر کام کو ایک مقدس اور خوشگوار فریضہ سمجھ کر کرتے تھے، یہیں مجھے طلبہ کے مسائل سے دلچسپی ہوئی۔ یہیں کالج پارلیمنٹ کی سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوا اور اس کا ڈپٹی لیڈر منتخب ہوا۔ یہیں سے وطن سے محبت، فرقہ پرستی سے نفرت اور سوشلزم سے ذہنی قربت سیکھی۔ ممکن ہے یہ سب کالج کی دین نہ ہو، میری افتاد طبع کا نتیجہ ہو۔ مگر آج اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ علی گڑھ پہنچا تو یہ چیزیں ساتھ لایا تھا۔ ہندوستان میں عیسائیوں کے جو ادارے ہیں، کچھ لوگ خواہ مخواہ ان سے بدظن ہیں۔ ان اداروں نے اچھی تعلیم اور اچھی تربیت کا ایک معیار قائم کیا ہے

جسے ملک کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

میں ۱۹۳۲ء میں علی گڈھ آیا۔ یہ راس مسعود کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ چونکہ میرے والد کا تبادلہ علی گڈھ ہو گیا تھا اس لئے انھیں کے پاس رہنے لگا۔ دوسرے سال جب یونین کا نائب صدر ہوا تو ایس، ایس اسٹیٹ ہوسٹل میں چلا آیا۔ علی گڈھ میں سب سے پہلے خواجہ منظور حسین صاحب سے متاثر ہوا۔ یہ میرے انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی ادب پر گہری نظر کے علاوہ اردو ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ نہایت شرمیلے آدمی تھے۔ کلاس میں لیکچر دینے کے بجائے اپنے لیکچر پڑھا کرتے تھے۔ ان لیکچروں سے فائدہ اس وقت ممکن تھا جب خود بھی مطالعہ اچھا ہو۔ میرا انگریزی میں تخلیقی ادب کا مطالعہ اچھا خاصا تھا مگر باقاعدہ نہ تھا۔ شروع شروع میں ان کے لیکچر بے کیف معلوم ہوئے مگر جب خود پڑھنا شروع کیا تو ان کی خوبیاں آشکار ہوئیں۔ منظور صاحب اچھے طلبہ کی بڑی مدد کرتے تھے۔ ان کو مناسب ہدایت کرتے، خود اپنے پاس سے کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے۔ موقع موقع سے اردو ادب کے حوالے دیتے خواجہ صاحب اس زمانے میں علی گڈھ میگزین کے نگراں تھے، انھوں نے مجھے علی گڈھ میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا۔ اس سلسلہ میں رشید صاحب۔ سیدین صاحب اور علی گڈھ کے دوسرے اہل نظر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

خواجہ منظور حسین صاحب ادب کے رسیا، کتابوں کے عاشق اور نہایت باذوق آدمی تھے۔ انھوں نے مجھے ڈاکٹر جانسن اس طرح پڑھایا کہ مجھے جانسن کی شخصیت سے بھی ایک لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور اس زمانے میں میں نے

جانسن کی اہمیت پر رائے لٹریری سوسائٹی میں ایک مقالہ پڑھا۔ انھیں کے ذریعے سے میں اوب میں ترقی پسند تحریک سے روشناس ہوا۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف سے ملاقات انھیں کے ذریعے سے ہوئی۔ منظور صاحب آزادی ہند کے بعد لاہور چلے گئے۔ جاتے وقت مجھے لکھنؤ خط لکھا تھا تو غالب کا یہ شعر بھی اس میں درج تھا۔

کعبے ہی جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

خواجہ منظور صاحب سے میں شروع سے متاثر ہوا تھا۔ مگر کچھ اُن کے رکھ رکھاؤ اور کچھ میرے حجاب نے مجھے ان سے زیادہ قریب نہ ہونے دیا۔ رشید صاحب سے پہلی دفعہ میگزین کے لئے مضمون مانگنے کے لئے ملا تو رسمی ملاقات ہوئی۔ علی گڈھ والوں کی اصطلاح میں انھوں نے کچھ زیادہ لفٹ نہ دیا۔ دوبارہ ملا تو یونین کے ایک آل انڈیا مباحثے میں تقریر کر چکا تھا جس میں وہ بھی جج تھے۔ ابکے وہ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور مجھ پر لطف وکرم کی بارش کر دی میں ان کے یہاں اکثر جانے لگا۔ ہر مسئلے پر گھنٹوں گفت گو ہونے لگی۔ اُن کا گھر اچھا خاصا مہمان خانہ تھا۔ ہر قسم کے لوگ آتے، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین مولانا عبدالماجد دریابادی۔ اصغر گونڈوی۔ سید سلیمان ندوی، حفیظ جالندھری ان سب سے ملاقات رشید صاحب ہی کے یہاں ہوئی۔ رشید صاحب نے میرے اصرار پر میگزین کے لئے کئی مضمون لکھے۔ مجھے اپنے دوستوں سے ملایا۔ شروع شروع میں شعروادب کے عشق نے مجھے اصغر صاحب کا زیادہ گرویدہ

رکھا۔ کچھ یاد پڑتا ہے کہ ذاکر صاحب سے کئی دفعہ یونہی سی ملاقات ہوئی ۔ مگر سال ڈیڑھ سال کے بعد دیکھتا ہوں تو بہت سے سامری فن پیچھے رہ گئے اور میں ذاکر صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا۔

منظور صاحب نے مجھے عالمی معیاروں سے آشنا کیا۔ اور انگریزی ادب سے عشق سکھایا۔ رشید صاحب نے مجھے اردو ادب کی خدمت کی طرف مایل کیا' ذاکر صاحب نے ادب کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگ کرنا سکھایا۔ ایم اے کے دوران میں یونین کا نایب صدر تھا۔ اس سلسلے میں راس مسعود صاحب سے ربط ضبط بڑھا جو وایس چانسلر تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ فارسی اور اردو کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ گفتگو میں ان کی جادوگری مشہور تھی۔ بڑے حوصلے اور عزم کے آدمی تھے، مگر عملی قوت کم تھی۔ بہت سے ذہین آدمیوں کی طرح وہ خاصے آرام طلب تھے۔ علی گڑھ میں انھوں نے اچھے اچھے آدمی بلائے اور کئی مفید کام شروع کئے۔ مگر ان میں اتنا استقلال نہ تھا کہ وہ ان کاموں کی خاطر قدم جما کر بیٹھتے۔ اس لئے میں ان کا قایل رہا مگر ان سے زیادہ متاثر نہ ہو سکا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد والدین کی خواہش تھی کہ آئی، سی، ایس کروں۔ مگر میرا دل معلّمی کو پسند کرتا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک دفعہ روا داری میں کہا تھا کہ آئی' سی' ایس کر کے کیا کیجیے گا۔ کچھ علی گڑھ اور اردو کی خدمت کیجئے۔ یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور ایسی بیٹھی کہ پھر نہ نکل سکی۔ معلمی کے پیشے اور اردو ادب کی خدمت میں مجھے اب بھی وہ اعزاز و افتخار محسوس ہوتا ہے جو دولت و سیاست کی اونچی مسند کو بھی نصیب نہیں۔ ۱۹۳۴ء میں یہ فیصلہ کیا تھا، اس وقت سے اب تک

میری اور ملک کی زندگی میں کتنے نشیب و فراز آ چکے ہیں مگر وہ روحانی طمانیت اور ذہنی سکون جو اس لگاؤ سے حاصل ہوا ہے اب بھی میرا رفیق سفر ہے۔

منظور صاحب کا اثر مجھ پر طالب علمی کے زمانے تک بہت گہرا رہا۔ ۱۹۳۴ء کے اکتوبر سے میں شعبہ انگریزی میں لیکچرر ہو گیا۔ مگر رشید صاحب اور ذاکر صاحب سے میرا قرب بڑھتا گیا۔ رشید صاحب کی شرافت، خدمت خلق کا جذبہ، ان کا علی گڈھ سے عشق۔ وہ گپ جس کو انھوں نے ایک فن بنا دیا ہے، نوجوانوں کی ہمت افزائی، دوستوں کی پاسداری، یہ چیزیں اس زمانے میں بڑی کشش کا باعث تھیں۔ اُن کی خیال انگیز ظرافت اور ان کے جاندار اسلوب سے بھی میں خاصا متاثر تھا۔ مگر علی گڈھ سے ان کا اس درجہ رومانوی عشق میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ سرسید کی تحریک کا میرے دل میں بڑا احترام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا۔ اور انھیں اس قابل بنایا کہ وہ جدید دور کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ مگر ایم، اے او کالج سرسید کی فکر روشن کا صرف ایک گوشہ، وہ ان کے سنہرے خوابوں کی ایک ادھوری تعبیر اور ہماری تعلیمی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی بساط پر صرف ایک تختہ رنگیں ہے، سارا چمن نہیں۔ اس کے برخلاف ذاکر صاحب علی گڈھ کو عزیز رکھتے ہوئے بھی، اور اپنی چیز کسے عزیز نہیں ہوتی، اس کی خامیوں سے واقف تھے، ذاکر صاحب ان دیدہ وروں میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے علی گڈھ کی بستی چھوڑ کر جامعہ کے ویرانے میں پھول کھلائے تاکہ ملک کو قومی تعلیم کے تجربے سے آشنا کرائیں۔ انھوں نے مغرب کی

حکمت اور مشرق کے سوز دروں کو اپنی شخصیت میں اس طرح سمو لیا کہ ہر سیاسی دور کے لئے ایک آب حیات بن گئے۔ وہ فکر کی بلندی اور علم کی رفعت کے باوجود عمل کی راہ کو ہموار کرنے اور جامعہ کو قبول عام عطا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے گاندھی جی سے گہری وابستگی اور آزادی کی سیاسی جد و جہد سے ذہنی ہم آہنگی کے باوجود تعلیمی کاموں کی اپنی اہمیت اور آزادی کو برقرار رکھا۔ اور اُسے وقتی سیاست کا غلام نہ ہونے دیا۔ ذاکر صاحب ہی سب مجھے شروع سے ایک ایسا رہنما نظر آیا جو لیڈری نہیں کرتا، ساتھ چلتا ہے۔ جو اپنے منصب کی نہیں دوسروں کی فکر رکھتا ہے، جسے اپنے اوپر اتنا اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کی آزمائش کے پھیر میں نہیں پڑتا ان کے اثر سے مجھے اپنا کام، ایک بڑے سلسلے کا جز نظر آیا۔ ادب میں نشہ ہی نہیں نجات کا سامان بھی مل گیا۔ زندگی صرف فارغ البالی اور خوش پوشی نہیں، بلکہ افکار و اقدار پر ایمان اور ان کے برتنے کا دوسرا نام بن گئی ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ میں جامعہ میں آجاؤں۔ انھوں نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ اگر کرتے تو شاید میں ضرور چلا جاتا۔ مگر علی گڈھ میں مجھے درس و تدریس کے علاوہ شعر و ادب سے ایک گہرے لگاؤ اور اپنے مطالعے کو وسیع کرنے کی دُھن نے کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہاں ذاکر صاحب سے جو لگاؤ اس وقت ہو گیا تھا وقت کے ساتھ وہ گہرا ہی ہوتا رہا۔ میں نے جامعہ کی جوبلی بھی دیکھی، اور ذاکر صاحب کی علی گڈھ کی وائس چانسلر کا دور بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جوبلی میں ذاکر صاحب پر ایک عجیب جذب کا عالم طاری تھا۔ اُن کی وہ تقریر جو انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے سامنے کی تھی،

آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ انھوں نے قومی تعلیم کے سفینے کو وقتی سیاست کے گرداب سے بچانے کی جو کوشش اس وقت کی تھی اس کے نتائج بھی سامنے ہیں۔ علی گڈھ میں ان کی وائس چانسلری بھی میں نے دیکھی ہے۔ اُنھوں نے جس طرح علی گڈھ کی اس وقت مدد کی جب اس کا وجود خطرے میں تھا، اُسے قوم کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ذاکر صاحب مفکر ہیں مدبر نہیں۔ وہ فرشتہ صفت آدمی ہیں۔ داؤ پیچ سے واقف نہیں۔ لوگوں نے ان کی سادگی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سے ذاکر صاحب کا کچھ نہیں بگڑا۔ ذاکر صاحب اپنے راستے پر گامزن رہے۔ وہ لوگ جہاں تھے وہیں کے ہوکر رہ گئے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء کے زمانے میں دو شخصیتوں سے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ایک مولوی عبدالحق صاحب سے، دوسرے ڈاکٹر ضیاء الدین سے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں ایک ہفتے رہنے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اس زمانے میں علی گڈھ کی سب سے اہم شخصیت تھے اور اپنے داؤ پیچ کی وجہ سے علی گڈھ کے وائس چانسلر ہو گئے تھے، مجھے انھیں خاصے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور اسی مطالعے نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کی کہ اگر ہماری تعلیم کا مقصد ڈاکٹر ضیاء الدین جیسے لوگ پیدا کرنا ہے تو اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ تاثر کا صرف مثبت پہلو عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے ڈاکٹر ضیاء الدین کی پوری زندگی، ان کے معیار اور طریقے میرے سامنے تھے، میں نے اُن سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر تعلیم گاہوں کی قیادت ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں رہی تو علم، بیتر ے اور عمل، ترکیب کے مترادف ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب

کے یہاں ہر چیز اپنے اقتدار کے استحکام کی رو سے پرکھی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک انگریزی کے استادوں کا مقصد یونیورسٹی کے مہمانوں کے لئے سپاس نامے لکھنا، اور اردو کے استادوں کا مقصد ان کی شان میں قصیدے پڑھنا تھا۔ وہ اُبھرتے سورج، چلتی گاڑی کے ماننے والے تھے۔ وہ اپنی دانست میں علی گڑھ اور قوم کی بڑی خدمت کر رہے تھے۔ ان میں بلا کی عملی قوت تھی۔ وہ تھکنا اور مایوس ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔ مگر ان کے اثر سے استادوں میں علم کی لگن اور طلبہ میں علم کا جذبہ کم ہوگیا۔ اور سستی اور سطحی سیاست کے شکار ہوگئے۔ میں نے ان کی زندگی سے یہ سبق سیکھا کہ ایسے اشخاص اور ایسے میلانات کے ساتھ کبھی بھولے سے بھی رعایت نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے معاملے میں خاموش رہنا بھی جرم ہے۔

مولوی عبدالحق ان لوگوں میں سے ہیں جن کا احترام کئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا انھوں نے تحقیق و تنقید کی دنیا میں کمال پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اردو زبان و ادب کی اشاعت اور فروغ کے لئے بھی اپنی زندگی وقف کردی۔ انھوں نے اس انجمن ترقی اردو کو جو نور کا ایک چھوٹا سا دیا تھی روشنی کا ایک مینار بنا دیا۔ وہ نوجوانوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ باوجود پیرانہ سالی کے ادب میں تجربات کے بڑے حامی تھے اچھے مصنفوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ غریب طلبہ کی بڑی امداد کرتے ہیں علمی کام کرنے والوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں کہا تھا کہ اگر مجھے اپنا جانشین انتخاب کرنے کا موقع ملا تو سوائے سرور کے کسی اور کو نہیں لوں گا وہ برابر میرے حال پر شفقت کرتے رہے۔ مگر دلی آنے کے بعد جس طرح وہ وقتی سیاست کے سیلاب میں اردو کو بھی بہالے گئے۔ اس سے میں متفق نہیں ہو سکا۔

میں نے ۱۹۴۷ء میں ان سے الہ آباد میں کہا تھا کہ مولوی صاحب آپ ہندوستان ہی میں رہیئے۔ آپ کے گرد اردو کی خدمت کرنے والا ایک حلقہ ضرور جمع ہوجائے گا۔ میں نے اپنی خدمات بھی پیش کی تھیں۔ مگر مولوی صاحب نے کہا کہ پاکستان میں کوئی کام کرنے والا نہیں ہے۔ میرا جانا ضروری ہے۔ افسوس ہے وہاں کے لوگوں نے ان کی قدر نہیں کی۔ اور انھیں طاق پر بٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب مردم شناس نہیں ہیں۔ ان کے گرد بعض ایسے لوگ بھی جمع ہوجاتے ہیں جو کام کو ذاتی جاگیر اور تحریک کو اقتدار کا ایک آلہ بنا لیتے ہیں۔ مگر مولوی عبدالحق کی محبت سے مجھے اردو زبان و ادب کی خدمت کا ولولہ ملا۔ اُن کے خطوط نے میری ہمت افزائی کی۔ میری کتابوں پر تبصروں میں انھوں نے رسمی باتیں نہیں کیں بلکہ ایسی تعریف کی جو آئندہ کاموں کے لئے جوش اور جذبہ پیدا کردے۔ تعریف کے ساتھ ساتھ وہ میری کمزوریوں پر بھی مناسب الفاظ میں اشارہ کرتے رہے۔ میں نے تنقید میں بے لاگ رائے دینے کا گر اُن سے سیکھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کامیاب نہ ہوسکا ہوں۔

۱۹۴۵ء میں ذاکر صاحب کے مشورے سے میں دو سال کے لئے رام پور چلا گیا۔ مگر ڈیڑھ سال کے بعد ہی مجھے لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر کی جگہ مل گئی۔ اور اگست ۱۹۴۶ء میں میں نے اپنے نئے عہدے کا چارج لے لیا۔ لکھنؤ میں یونیورسٹی اور شہر کے سب سے ممتاز لوگوں سے میری ملاقات ہوئی مگر اب سوچتا ہوں تو تین نام ایسے ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ ایک رشید جہاں کا، دوسرا آچاریہ نریندر دیو کا، اور تیسرا چیلاپتی راؤ کا۔ رشید جہاں پر

اقبال کا یہ شعر ہر طرح چسپاں ہوتا ہے۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

میں اُن کے والد اور کئی بہنوں کو جانتا تھا۔ مگر ان سے میری ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اور بہت جلد اُن کے خلوص، ذہانت، گرمجوشی، صاف گوئی اور جذبۂ خدمت کا قایل ہو گیا، رشید جہاں بڑی دلکش شخصیت کی مالک تھیں، وہ ہر معاملے میں انتہا پسند تھیں۔ اُن کے یہاں دوست، دشمن کے دو ہی خانے تھے۔ بیچ کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ بہت جلد خفا ہو جاتیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد صاف بھی ہو جاتیں۔ اُن کے آئینۂ دل میں غبار کا نام نہ تھا۔ وہ بڑی پکّی کیمونسٹ تھیں۔ جب رندیوے کے عروج کا زمانہ آیا اور پی، سی جوشی نکالے گئے تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اُن سے کہا کہ اس قدر تنگ نظری اور سخت گیری کا اثر پارٹی پر برا پڑے گا، انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ نہیں سرور صاحب اچھا ہوا کائی چھٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ ان کی رائے غلط تھی۔ مگر وہ اس پر نہایت اعتماد کے ساتھ قائم تھیں، میں نے انند نرائن ملا کے مجموعہ کلام "جوئے شیر" پر دیباچہ لکھا تو ان کی انسان دوستی اور ان کی فن کاری کی تعریف کی۔ رشید جہاں شاعری میں فارمولے کی بہت قایل تھیں۔ انھیں میری یہ تعریف پسند نہ آئی۔ ہم لوگوں میں بحث ہوتی تو دیکھنے والوں کو خیال ہوتا کہ لڑائی ہو گئی۔ مگر وہ کچھ دیر کے بعد ویسی ہی شگفتہ اور مہربان ہو جاتیں۔ وہ بڑی اچھی دوست اور ان تھک کارکن تھیں۔ وہ کسی سے مرعوب ہونے والی نہیں تھیں۔ اپنے مسلک کی خاطر انھوں نے بڑی تکلیف

اٹھائی اور بڑی قربانیاں دیں۔ انھوں نے کتنے ہی نوجوان لڑکوں لڑکیوں کی ہمت افزائی کی اور ان میں لگن، جستجو اور حرارت پیدا کی۔ انھیں ادب سے سچا عشق تھا۔ اور اس کے حیات بخش اور انقلاب آفریں رول کی بڑی قایل تھیں۔ سیاست میں انہماک نے انھیں نہ ڈاکٹری پر پوری توجہ کرنے دی، نہ ادب پر۔ انھیں اس کا افسوس بھی تھا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بہت زیادہ لکھنے کا وہ دلولہ رکھتی تھیں۔ مگر سرطان کے موذی مرض نے انھیں آلیا۔ وہ واقعی ایک شعلہ تھیں، تابناک اور روح پرور، افسوس ہے کہ یہ شعلہ بجھ گیا۔ رشید جہاں میں یقین محکم بھی تھا اور عمل پیہم بھی۔ یہ یقین محکم کسی ایک سلک کا اجارہ نہیں ہے۔ بلکہ جہاں ہو اپنا اثر دکھاتا ہے۔

اچاریہ نریندر دیو دیکھنے میں بڑے منحنی، بیمار اور یونہیں سے آدمی لگتے تھے۔ مگر بڑے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کا سا علم و فضل، تحریر و تقریر کا ملکہ، سیرت کی پاکیزگی اور مزاج کی نرمی بہت کم دیکھنے میں آئی ہے جب وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ذاکر صاحب کی طرح وہ بھی مردم شناس نہیں تھے۔ مگر ان میں ذاکر صاحب کی سی لوگوں کو متاثر کرنے اور ان میں کام کا دلولہ پیدا کرنے کی صلاحیت تھی۔ ان کی شخصیت میں بلا کا جادو تھا۔ طلبہ ان کے پرستار تھے۔ اساتذہ کی قوم بڑی کافر قوم ہے۔ یہ کم کسی پر ایمان لاتی ہے۔ مگر اساتذہ میں بھی ان کا احترام کرنے اور ان سے محبت کرنے والے بہت تھے۔ وہ سوشلسٹ پارٹی کے صدر تھے، مگر دراصل سیاست کے مرد میدان نہ تھے۔ وہ تو اس لئے بنے تھے کہ ایک

ذہنی تحریک کے قائد ہوں۔ خود تصنیف و تالیف میں مشغول رہیں اور دوسروں کو اس کی طرف مائل کریں۔ دمے کے مرض نے یوں بھی ان کی عملی صلاحیتوں کو کم کر رکھا تھا وہ ہر علمی مسئلے پر ایک سنجیدہ اور متوازن نقطہ نظر سے سوچتے تھے۔ ہماری مشترک تہذیب کے قائل تھے۔ ہندی کے بہت ممتاز ادیب ہوتے ہوئے بھی اردو ادب کے دلدادہ تھے۔ اور اردو میں بڑی اچھی تقریر کرتے تھے۔ اچاریہ نریندر دیو سے اکثر سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل پر باتیں ہوتیں۔ وہ نظریاتی طور پر کھرے سوشلسٹ تھے۔ گاندھی جی کی اخلاقی عظمت کو مانتے تھے مگر گاندھی ازم اور سوشلزم کا ملاپ انھیں پسند نہ تھا۔ بدھ کے فلسفے کے خاصے دلدادہ ہوتے ہوئے بھی سیاسی امور میں وہ مارکس کے نظریات سے انحراف کو غلط سمجھتے تھے، مگر کمیونزم کو گمراہی تصور کرتے تھے۔ اچاریہ نریندر دیو اس چراغ رہ گزر کی طرح تھے جس کے سہارے ہر راہرو کچھ دور بے کھٹکے جا سکتا ہے۔ مگر بالآخر اپنے گھر کی گلی اسے اپنی فکر کی روشنی کے سہارے طے کرنی پڑتی ہے۔ میرے لیے بھی وہ ایسا ہی ایک چراغ تھے۔

جیلاپتی راؤ سے شاید اردو داں طبقہ کم ہی واقف ہو۔ یہ نیشنل ہیرلڈ کے ایڈیٹر ہیں۔ اور کیسے ایڈیٹر، جن کی وجہ سے اخبار کی مشرق و مغرب میں آبرو قائم ہے۔ نہایت کم گو، شرمیلے، کچھ بے ہنگم، عورتوں سے خائف رہنے والے، گلا شاید بچپن سے خراب ہے جس کی وجہ سے آواز کبھی صاف نہیں نکلتی۔ خیالات کے اعتبار سے ترقی پسند ہیں۔ اور اس سے بعض لوگ انھیں کمیونسٹ کہتے ہیں۔ زندگی، صحافت، ادب، سیاست، سماج میں بلند ترین معیاروں کے نہ صرف

قائل ہیں بلکہ ان کو برتتے بھی ہیں۔ انھیں نہ کبھی کسی وزیر کے یہاں کسی نے دیکھا نہ کسی کے دربار میں۔ ان کے اداریے ایسے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے بار بار مزے لے لے کے پڑھتے ہیں۔ اچھی انگریزی، پرمغز اسلوب اور جان دار الفاظ کے ساتھ ظرافت کی ایک چاشنی اُن کا امتیاز ہے۔ بڑے سچے، سیدھے اور وضعدار آدمی ہیں۔ ایسا بے تعصب اور کھلے دل کا آدمی میری نظر سے کم گذرا ہے۔ لیڈروں میں وہ صرف جواہر لال نہرو اور مرحوم رفیع احمد قدوائی کے قائل ہیں مگر ان کی نکتہ چینی سے یہ لوگ بھی نہیں بچے۔ جب تک چیلاپتی راؤ جیسے لوگ اخبار نکالتے رہیں گے ریاکاری، منافقت، سیاسی بازیگری، ملمع سازی کا پردہ فاش ہوتا رہے گا۔ چیلاپتی راؤ نے اپنے اخبار کو ایک تہذیبی ادارہ بنادیا ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جب گورنر کے، ایم منشی نے یونیورسٹیوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی تو چیلاپتی راؤ سینہ سپر ہوئے۔ ایسے ایسے اداریے لکھے کہ منشی کے خوب صورت الفاظ کا طلسم ٹوٹ گیا۔ احیا پرستی، تنگ نظری، تعصب، بددیانتی، فرعونیت پر چیلاپتی راؤ ہمیشہ وار کرتے رہے ہیں۔ اور اُن کا وار کبھی اوچھا نہیں پڑا۔

میں نے ابھی تک اشخاص کا ذکر کیا ہے۔ اُن واقعات کا نہیں جن سے میں متاثر ہوا ہوں۔ چند واقعات مجھے خاص طور سے یاد آتے ہیں۔ جن میں پہلا ہیروشیما پر اٹم بم گرنے کا واقعہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کا اثر اتنا پڑا اور ایسا ہوا تھا کہ جنگ سے تنفر کے سوا اور کوئی جذبہ میں اپنے میں نہ پاسکا۔ مگر ہیروشیما کے تباہ ہونے سے میری روح لرز گئی۔ اکثر خیال آیا ہے کہ لڑائی میں لاکھوں کروڑوں جانیں، انسانیت کے کتنے ہی اقدار، تہذیب کے کتنے ہی خزانے،

حسن و عشق کے ان گنت کرشمے، چند حکمرانوں کی ہٹ یا نفرت یا خوف کی وجہ سے برباد ہو سکتے ہیں۔ مگر پچھلی لڑائیوں اور اس لڑائی میں یہ فرق کتنا بھیانک ہے کہ صرف لڑنے والے ہی نہیں معصوم عورتیں اور بچے، فن کار، سائنس داں، مزدور، عاشق، باپ، بھائی، ماں، بہن کی زندگی کے وہ نازک اور ریشمی تانے بانے اس طرح آن واحد میں ٹوٹ جاتے ہیں، اور بھری بستیوں اور جگمگاتی شاہراہوں کی جگہ راکھ کا ڈھیر رہ جاتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس ظلم کو صرف انسانیت کی اعلیٰ اقدار ہی روک سکتی ہیں۔ اور وہ بھی اس وقت جب دنیا کے تمام انسانوں کا ضمیر بیدار ہو جائے۔

دوسرا واقعہ جس نے برسوں مجھے مضمحل، افسردہ، زخمی اور ملول رکھا وہ ملک کی تقسیم اور اس کے بعد فسادات کا ہولناک سلسلہ تھا۔ ملک کی تقسیم چند ارباب سیاست نے کرائی، نتیجہ عوام نے بھگتا۔ اس میں وہ لوگ بچ گئے جن کے پاس پیسہ تھا یا جن کا اثر تھا۔ مگر عوام اور متوسط طبقہ پس گیا۔ کچھ ہندوؤں میں صدیوں کی سوئی ہوئی نفرت جاگ اٹھی۔ کچھ مسلمانوں نے نفرت کا جواب نفرت سے اور تلوار کا جواب بندوق سے دیا۔ رفتہ رفتہ حالات پر قابو پایا گیا اور اب کچھ لوگ بھولتے جاتے ہیں کہ ہندوستان میں گیارہ سال پہلے کس طرح تہذیب اور انسانیت کا جنازہ نکلا تھا۔ کس طرح عورتوں کی بے آبروئی ہوئی تھی۔ کس طرح بچوں کو ایذائیں دیکر ہلاک کیا گیا تھا۔ کس طرح خاندان کے خاندان اور گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد کر دیے گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صرف مغربی سیاست یا فرقہ واریت کو

الزام دینے سے ان کی روح کا بوجھ ہلکا ہوسکتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر ہم ہندوستانی ابھی تک اوپری دل سے انسانیت اور تہذیب کا نام لیتے ہیں۔ ہماری امن پسندی بھی اُن کا ایک پردہ ہے۔ ہمارے دلوں میں صدیوں کی نفسیاتی گرہیں ہیں۔ ہماری سیاست صاف دل اور پاک ذہن لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی، برہمن، ٹھاکر، بنیے، بنگالی، پنجابی اب تک ایسے کتنے ہی خانے ہمارے دلوں کی تقسیم کئے ہوئے ہیں۔ ہم کسی کے ڈنڈے کے خوف سے خاموش تھے۔ جیسے ہی ڈنڈے کا خوف ختم ہوا ہماری اصلیت بے نقاب ہوگئی۔ اس اصلیت کو آج بھی نظرانداز کرنا جرم ہوگا۔ ابھی یہ پھر بے نقاب ہوسکتی ہے۔ یہ مرض چند سالوں میں جانے والا بھی نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت خاموش اور ٹھوس اقدام کرنے ہوں گے۔

گاندھی جی کی شہادت ایک اور واقعہ ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ یہ شہادت گاندھی جی کو ان سنتوں اور بزرگوں کی صف میں کھڑا کردیتی ہے جنھوں نے اپنی جان قربان کرکے انسانیت کی شمع کو روشن رکھا۔ مگر اس سے اس دور کے ہندوستان کی عام ذہنی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ قوم اتنی دیوانی ہوسکتی ہے کہ اپنے محسنِ اعظم کی جان لے لے۔ جو نجات کا راستہ دکھائے، جو آزادی کی منزل سے ہم کنار کرے، جو ہندوستان کا نام دنیا میں بلند کردے، جس کی سیرت اور شخصیت انسانیت کے لئے باعثِ فخر ہوا سے، اس کی قوم کا ایک دیوانہ اس طرح ختم کردے۔ ہندوستان

کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت گاندھی جی کی زندگی اور موت ہے۔ اور ان کی اس طرح موت میں اسکی پستی کا اشارہ بھی ہے۔ گاندھی جی کی شہادت نے ضرور ہندوستان کے سوئے ضمیر کو کچھ عرصہ کے لئے بیدار کر دیا۔ اُسے ایک بھیانک خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اُسے تباہی کے غار میں جانے سے بچالیا لیکن کیا اس غار کا منھ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ کیا وہ خطرہ بالآخر ٹل گیا ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

ایک اور واقعہ جس کا مجھ پر اب تک اثر ہے مولانا آزاد کی موت ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مولانا آزاد سے ادھر دس برس میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ انجمن اور ساہتیہ اکاڈمی کے کاموں کے سلسلے میں تبادلہ خیالات ہوا۔ ان کی آخری تقریر بھی اردو کانفرنس میں سنی، مگر ان کی زندگی کا وہ اثر میرے اوپر نہیں جو ان کی موت کا ہے۔ میں اتفاق سے اُس دن دہلی میں موجود تھا اور جب وہ نزع کے عالم میں تھے، اس وقت بہت سے غم زدہ اشخاص کے ساتھ میں بھی دوسرے کمرے میں تھا۔ پھر ان کے جنازے میں شریک ہوا۔ وہ منظر میں ساری عمر نہیں بھول سکتا۔ ہم ہندوستانی فطرتاً تماشائی ہیں اور غالب کے اس شعر پر اکثر عمل کرتے ہیں۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مولانا آزاد کا جنازہ دیکھنے کے لئے جو ہجوم اُبل پڑا تھا، اس میں تماشائی بھی تھے اور اہل نظر بھی۔ یہ ہجوم بذات خود ایک شاندار زندگی کی تکمیل،

ایک پرشکوہ داستان کا تمت، ایک المیہ کا وہ آخری سین تھا جب آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر دل میں ایک کسک بیدار ہو جاتی ہے۔ یہ نئے ہندوستان کی اس بے پایاں عقیدت اور محبت کی ایک علامت تھا جو اُسے اپنے معمار، عملی رہنما، مفکر، مدبر ادیب اور عالم سے تھی۔ دہلی کی سرزمین نے بہت سے بادشاہوں کے جلوس دیکھے ہیں، مگر ایسا شاہانہ ماتمی جلوس شاید ہی اس نے کبھی دیکھا ہو۔ لال قلعے اور جامع مسجد کے سامنے سے کتنے ہی باعمل کارواں گذر رہے ہیں۔ مگر اس کاروان کی شان نرالی تھی۔ یہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک روایت، ایک دور، ایک وضع، ایک اسلوب کا ماتم گسار تھا۔ مولانا آزاد کے مرنے سے ہمارا وہ شاندار ماضی ہم سے رخصت ہو گیا۔ جس کے درد و داغ اور سوز و ساز سے افسانے حقیقت بنے، اور حقیقت میں افسانوں کا سحر پیدا ہو گیا۔ جتنے لوگ مولانا کے جنازے میں شریک تھے وہ سب یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب کوئی شخصیت اس طرح ایک ادارہ نہ کہلائے گی۔ کسی کو یہ عظمت حاصل نہ ہوگی کہ نہرو اُسے اپنا بزرگ سمجھیں اور جو نہرو کے اصولوں کی خاطر ان کے عمل سے اختلاف کر سکے۔ مذہب، سیاست، ادب تینوں یکساں ایک فرد کا اس طرح ماتم نہ کریں گے۔ مولانا آزاد آخر میں خاصے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ادب سے اُن کا واسطہ یونہی سارہ گیا تھا، تفسیر کا کام عرصے سے رکا ہوا تھا، ان کا انداز گل افشانی گفتار کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتا تھا۔ اُن کی صحت خراب رہتی تھی، اور وہ ذہنی طور پر بجھے بجھے سے اور کچھ اکیلے سے نظر آتے تھے۔ مگر ہندوستان کی سیاست پر ان کی گرفت مضبوط تھی، وہ آخر وقت تک ہر اہم فیصلے میں معاون ہوتے رہے۔ ادب اور مذہب کی

نجرومی سیاست کی طاقت بن گئی، ساہتیہ اکاڈمی ان کی تمام تصانیف کی اشاعت کا انتظام کررہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حکومت ان افکار و اقدار کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ جن کا وزن و وقار ابوالکلام آزاد میں مجسم ہوگیا تھا۔ اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ ملک ان افکار و اقدار کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے۔

بالکل حال کا ایک واقعہ ہے جس نے مجھے بُری طرح چونکا دیا ہے، یہ ہے نہرو کی کچھ عرصے کے لئے حکومت سے علیحدگی کی خواہش۔ گویا لوگوں کی خوشامد نے جواہر لال نہرو کو بالآخر اس ارادے سے باز رکھا، مگر مسئلہ جوں کا توں موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا نہرو کی بنائی ہوئی عمارت اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کہ وہ آئے دن کی آندھیوں کا مقابلہ کرسکے۔ کیا جمہوریت دلوں میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ کیا قومیت کے نشے سے سب سرشار ہیں کیا مذہبی دیوانگی اور تعصب ملک میں ترک اٹھا چکا ہے۔ کیا لسانی سامراج کا خطرہ ٹل گیا ہے، کیا ہمارا نظم حکومت دیانت، عدل اور فرض شناسی کا علم بردار ہے کیا اُردو اور دوسری قومی زبانوں کے ساتھ انصاف کا جذبہ عام ہے۔ کیا اقلیتوں کی تہذیب کے پامال ہوجانے کا امکان ختم ہوچکا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو اب تک کیوں نہیں ہوا۔ دس برس میں جاپان اور جرمنی اپنے زخموں کو چاٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور آج وہ دنیا میں ایک طاقت ہیں۔ دس برس میں ہم نے تقسیم کے جنون سے نجات پائی ہے۔ ملک میں امن قائم کیا ہے۔ سوشلسٹ سماج کی طرف دیکھنا شروع کیا ہے۔ دیسی ریاستوں کے جاگیردارانہ نظام کو ختم کیا ہے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے سے گذر رہے ہیں۔ دنیا میں گاندھی اور

اور نہرو کی وجہ سے کچھ اخلاقی عظمت حاصل کی ہے۔ جنگ کے جنون کو کم کیا ہے اور عالمی امن میں مدد دی ہے۔ ملک میں اظہار خیال کی آزادی کو فروغ دیا ہے مگر کیا ہر پہلو کو دیکھتے ہوئے ہم ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ اب پیچھے کی طرف لوٹنے کا سوال نہیں رہا۔ نہرو کی واپسی اطمینان بخش ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ نہرو کی فتح ہو چکی۔ ابھی تو صرف معرکہ ٹل گیا ہے۔ آیندہ چند سالوں میں معلوم ہوگا کہ اس معصوم، مخلص اور محبوب رہنما کے گرد مخلص اور مفید کارکن کتنے ہیں جو اس کے کام کو جاری رکھ سکیں۔ نہرو کی عظمت کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ ملک کا مستقبل اس سے وابستہ ہے۔ مگر ملک کے مستقبل کے لئے یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جیسا کہ کنگسلے مارٹن "نہرو کے ہندوستان کے دس سال" میں کہتا ہے۔

"چونکہ نہرو نے کوئی پارٹی نہیں بنائی، اس لئے یہ سوال
قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی پارٹی ان کی روایت
کو زندہ رکھ سکے گی"

بظاہر ادب کے ایک طالب علم کے لئے جس کا عملی سیاست سے کوئی براہِ راست تعلق نہ ہو، یہ اندیشہ ہائے دور و دراز بے معنی ہیں۔ مگر میں تو ادب کو ایک تہذیبی پس منظر میں اور تہذیب کو سماجی تبدیلیوں کے دائرے میں دیکھتا ہوں۔ مجھے ادب کے جمالیاتی پہلو کا پورا پورا احساس ہے۔ مگر اس کے اخلاقی اور سماجی پہلو سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ میں جب ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ مستقبل جمہوریت کے فروغ،

قومیت کے استحکام اور مشترک تہذیب کے تصور کے عام ہونے سے وابستہ ہے،
اس مقدس کام میں اردو والے مدد کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا سر انجام پانا صرف
ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ ہاں یہ امید ضرور ہے کہ اگر وہ جدید ہندوستان
کی تعمیر میں تن من دھن سے لگ جائیں گے تو اُن کا ہی نہیں پورے ملک کا فائدہ
ہوگا۔ گزیں پامال ہو سکتی ہیں برباد نہیں ہو سکتیں اور نقش کبھی کبھار مٹ مٹ کر
سنورتے ہیں۔

گاندھی جی کے فلسفے سے میں کبھی پوری طرح متفق نہ ہو سکا۔ مجھے ہمیشہ یہ
احساس رہا کہ آپ کی مسلم نیک نیتی اور خلوص کے باوجود آپ کے نسخے میں ہمارے
درد کا مکمل علاج نہیں ہے۔ مگر گاندھی جی کی اخلاقی عظمت سے کون انکار کر سکتا
ہے۔ پھر گاندھی جی نے جس طرح اپنی موت کا راستہ پسند کیا، اور مجھے یقین ہے کہ
گاندھی جی جب آخر عمر میں یہ راستہ اختیار کر رہے تھے تو جانتے تھے کہ اس کا انجام
کیا ہوگا اور جس طرح اپنے ہم وطنوں کو یہ احساس دلایا کہ ظلم کسی کے ساتھ ہو سارے ملک
پر ظلم ہے۔ اور ملک کے ساتھ انصاف کا دعویٰ اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب اس کی
ہر اقلیت کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اُسے اور کوئی فراموش کر دے، اقلیتیں کبھی
فراموش نہیں کر سکتیں۔ میں تو اسے کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں جب اس واقعہ کو یاد کرتا
ہوں تو احسان کا جذبہ کم ابھرتا ہے، فخر کا زیادہ۔ ہماری قوم ابھی پستی کی حالت میں
ہے۔ ابھی اس کا قومی کردار بنا نہیں، جمہوریت اور مساوات کے تخیل سے وہ کام
لیتی ہے اس پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ ابھی وہ سستی فتح کے تیز و تند نشے میں
گرفتار ہے۔ مگر اس میں گاندھی جی جیسا انسان — عظیم انسان — گذرا ہے،

اور ابھی نہرو جیسا مخلص اور کھرا رہنما میسر ہے اور اس کے کروڑوں افراد میں ایسے لوگ بھی کم نہیں ہیں جو بلند نگاہ، پرسوز شخصیت، اور دلنواز سخن رکھتے ہیں، اس لئے آج جب شباب کی آندھی ختم ہو چکی ہے اور میری عمر کا پینتالیسواں سال چل رہا ہے اور دل میں بہت سے زخم اور روح میں بہت سی خراشیں ہیں، پھر بھی میں مایوس نہیں ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ شاید کچھ اور ٹھوکریں کھاکر، اور کچھ اور دکھ جھیل کر، ہمارا قومی کاروان ضرور اس منزل کی طرف گامزن ہوگا۔ جو ہمارا مقدر ہے اور ہم اپنے دیس میں ذہنی آزادی، سماجی انصاف اور مادّی خوشحالی کی جنت بنا سکیں گے، ہاں یہ جانتا ہوں کہ یہ کام آج کے سیاسی شعبدہ بازی سے نہیں بلکہ ادیبوں، دانش وروں، سائنس دانوں، معلموں اور فن کاروں کی اس متحدہ کوشش سے انجام پائے گا جو نعروں سے نہیں بلکہ خونِ جگر سے وجود میں آتی ہے، اور جس کے لئے صرف مشرق یا صرف مغرب، صرف قدیم یا جدید نہیں، بلکہ انسانیت کی پوری تاریخ اور تہذیب کی پوری تصویر کام آئے گی۔ رہا میں تو، میں نے اب تک جو کچھ سیکھا ہے اس کا ماحصل یہی ہے کہ عاشق ہونا کافی نہیں، عارف ہونا بھی ضروری ہے۔ عشق بے صبر ہوتا ہے، عرفان حقیقت کے علم کی وجہ سے بے صبری کا شکار نہیں ہوتا۔ عاشق بیج بوتے ہی لہلہاتی ہوئی کھیتی کا تصور کرنے لگتا ہے اور پھر مایوس ہو جاتا ہے، عارف جانتا ہے کہ کھیتی کو کھلیان بننے میں کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شخصیت کا حسن، ذہانت کی چمک دمک میں نہیں، کردار کی استواری اور مضبوطی میں ہے۔ جو زندہ اور توانا خیالات سے آتی ہے۔ چھوٹے راستہ خطرناک ہیں۔ خدمت

بالآخر اپنا حق منوا لیتی ہے۔ ادب سب سے اچھا نشہ ہے کیونکہ اس میں نجات کا سامان بھی ہے، اور ہم میں سے بیشتر صرف در اصل اپنے عاشق ہیں۔ اس لیئے میر کا یہ شعر ہم سب کے لئے بصیرت افروز ہے۔

اے آہوان کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر، کسی کا شکار ہو!

میں اپنے زخموں کے کاٹھات پر شرمندگی نہیں محسوس کرتا۔ کیونکہ بقول غالب۔

ہر سنگ وخشت ہے صدفِ گوہر شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سوداگرے کوئی

علی گڈھ
۳۰ رمئی ۵۸ء

ڈاکٹر محمد اشرف

آپ کی فرمائش ہے کہ میں اُن شخصیتوں اور اُن واقعات کے بارے میں کچھ عرض کروں جنھوں نے میری زندگی پر اثر ڈالا ہے۔ اور میں کسی قدر پریشان ہوں کہ اس سوال کا جواب دوں تو کیونکر دوں۔ سنہ ۱۹۱۵ء کے قریب جس کو اب ۴۲، ۴۳ برس ہوتے ہیں میں نے ہوش سنبھالا۔ اب آپ ہی غور فرمائیے کہ اس مدت میں دنیا اور محض ہمارے وطن میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ دنیا نے انقلاب سنہ ۱۹۱۸ء سے لے کر اسپوتنک تک اور ہم نے غلامی سے لے کر آزادی تک جانے کتنی منزلیں طے کیں۔ اسے میری خوش نصیبی سمجھیے کہ ہوش سنبھالتے ہی میں نے اپنے سماجی ماحول سے دلچسپی لینا شروع کی اور

مجھے اس عہد کی بعض تحریکوں اور مشاہیر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ غالباً یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اس دور کے بہت سے نوجوانوں کی طرح' مجھے بھی کم از کم ذہنی طور پر' بعض "مقامات" سے گزرنا پڑا۔ اور میں آج بھی یہی محسوس کرتا ہوں کہ

'صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش است'

پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس ہنگامہ خیز دور کے تاثرات کا اندازہ کیونکر لگایا جائے بالخصوص ایسی صورت میں جب تجربات کے ساتھ ساتھ تاثر کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ کسی شخصیت یا واقعہ کا اثر دیرپا ہو۔ البتہ نوجوانی کے بعض واقعات مجھے یاد ہیں اور تعمیل حکم کے طور پر عرض کرتا ہوں۔

(۱)

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو میں مراد آباد (اترپردیش) میں مسلم اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور اس اسکول کے ایک استاد کے ساتھ اُن کے گھر محلہ کسرول میں رہتا تھا۔ مجھے یہ دن اس لئے اور بھی یاد ہیں کہ اعلان جنگ کے کچھ دن بعد میرے والد کو دردانیال اور مشرقی افریقہ کی مہم پر جانا پڑا اور گھر بار کا ذمہ مجھے سونپا گیا۔ والد صاحب کے جذبۂ "وفاداری" کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوگا کہ جب دہلی جنکشن سے ان کی فوجی اسپشل روانہ ہوئی اور انھوں نے مجھے آبدیدہ دیکھا تو دلاسا دینے یا سینہ سے لگانے کی بجائے راجپوتی غیرت

یاد دلاکر جھڑکیاں دیں اور حق نمک خواری پر خاصہ لکچر دے دیا۔ نتیجہ یہ کہ میں کامل صبر و سکون کے ساتھ اپنی تعلیم اور اپنے چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ میری عمر اس وقت بارہ برس کے قریب ہو گی۔ یہ البتہ ہوا کہ لڑائی کا حال معلوم کرنے کے شوق میں میں نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

تھوڑے دن بعد جب دردانیال کی پسپائی کی خبر آئی تو مجھے والد کے بارے میں تشویش ہوئی اور میں نے مسجد کی راہ لی۔ ہلکے ہلکے چاشت و اشراق بھی معمولات میں داخل ہو گئے۔ رمضان میں تراویح پڑھنے کا شوق دامنگیر رہا۔ کبھی کبھار میں شبینہ میں بھی شریک ہوتا تھا۔ مراد آباد کے دیندار مسلمان اس زمانہ میں آریہ سماج کے مناظروں سے بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اور رامچند اور مولوی مرتضیٰ حسن کی بحث سننے دور دور سے آ کر جمع ہوتے تھے۔ دوسرا محبوب مشغلہ پارسی تھیٹریکل کمپنی کا ناٹک "خون ناحق" اور اس کا حسین ایکٹر نثار تھا جسے دیکھنے کی خاطر بعض لوگوں نے اپنی ضرورت کی چیزیں تک بیچ دی تھیں۔ مجھے ان مناظروں اور کھیلوں سے البتہ کوئی رغبت نہ ہوئی جس کی واحد وجہ مولوی اصطفےٰ کریم کی اور ہماری نئی جماعت خذب تھی۔ اصطفےٰ کریم علی گڑھ کالج کے گریجویٹ تھے اور ہمارے مدرسہ میں حال میں آئے تھے۔ وضع قطع میں وہ علی گڑھ کے معلوم ہوتے تھے، وطن بہلول (اودھ) تھا۔ مگر ویسے تھے نرے مولوی یعنی مسجد میں سب سے پہلے آتے اور سب سے آخر میں جاتے تھے۔ چنانچہ میری اور دوسرے طالب علموں کی ان سے خاصی ملاقات ہو گئی۔ کچھ دن بعد آنا جانا ہو گیا۔ بلکہ ہر اتوار کی صبح دیوان بازار

ہی ان کے گھر پر ایک اجتماع ہونے لگا۔ انہوں نے شروع شروع میں حسرت موہانی کی بعض غزلیں سنائیں۔ مثلاً:-

"ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی"

"عیش دل و جان ہے کرم یار پہ موقوف"

وغیرہ۔ پھر اقبال کا نمبر آیا اور شکوہ سے دل بہلانے لگے۔ غالباً تیسرے ہفتے سورۃ صف اور سورۃ جمعہ کا درس شروع ہوا جس میں ایک خاص قسم کی جاذبیت تھی۔ لب لباب ان سب تعلیمات کا یہ جتانا تھا۔ کہ جہاد بالسیف ہر مسلمان پر فرض ہے اور اسلام کے سب سے دشمن انگریز ہیں۔ بالآخر یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ اصطفےٰ کریم دراصل مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد اور ایک خفیہ جماعت مجاہدین کے ممبر ہیں جو انگریزوں کے خلاف جہاد کی تنظیم میں سرگرم ہے۔ تھوڑے دن بعد ہم سب نے بھی جہاد کا حلف لیا اور "حذب اللہ" کے ممبر بن گئے۔ یوں سمجھیے کہ ہمارا سیاسی سفر شروع ہوگیا۔

میرا گھرانا تو ریاست الور کا ہے۔ مگر میرے دادا ضلع علی گڑھ کے ایک گاؤں میں بس گئے تھے۔ چنانچہ میری جب بھی چھٹی ہوتی میں علیگڈھ جایا کرتا تھا۔ حذب اللہ کی شرکت کے بعد مجھے شوق ہوا کہ حسرت اور بیگم حسرت کی زیارت کی جائے۔ یہ اس لیے بھی کہ حسرت علی گڑھ کے پہلے گریجویٹ تھے جس نے "سودیشی" تحریک میں حصہ لیا تھا اور کئی بار جیل خانے گئے تھے۔ حسرت اب بھی جیل ہی میں تھے۔ مگر بیگم حسرت نے رسلگنج میں سودیشی کپڑے کی دکان کھول لی تھی۔ میں نے پہلی بار بیگم حسرت کو سیاہ ترکی برقع پہنے

اسی دُکان پر دیکھا۔ وہ اخلاق کیا مادرانہ شفقت سے پیش آئیں اور میرے اوپر اُن کی محبت کا اثر اس لئے اور بھی ہوا کہ میں ماں سے محروم ہو چکا تھا۔ دوسرے دن صبح انہوں نے مجھے اپنے " در دولت " پر یاد فرمایا۔ یہ در دولت دراصل دھرمپور کوٹھی میں نوکروں کے رہنے کا کمرہ تھا اور بیگم اسی شاگرد پیشہ میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان کی دوکان کا سارا اساسہ غالباً دو سو روپیہ سے کم ہوگا۔ بکری بھی برائے نام تھی۔ خفیہ پولیس برابر نگرانی کرتی تھی۔ گرفتاری اور تلاشی کا ہر وقت کھٹکا رہتا تھا۔ مگر بیگم حسرت کے بشرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دنیا بھر کی دولت اور ہر قسم کا آرام انہیں نصیب ہے۔ اُن کی اور حسرت کی یہ فاقہ مستی زندگی بھر رہی اور مجھے یہ کہتے ہوئے ایک مسرت سی محسوس ہوتی ہے کہ میں اُن کی شفقت سے کبھی محروم نہ رہا۔ مشکل البتہ یہ پیش آئی کہ اسطفے کریم کی تعلیم جہاد کے بعد جب حسرت اور بیگم حسرت عملی نمونہ کے طور پر سامنے آگئے تو ایک زمانہ تک اس کسوٹی پر پھر کوئی دوسرا رہنما پورا نہ اُتر سکا۔

(۲)

جنگ عظیم کے بعد ہماری جدوجہد آزادی کا ایک نیا اور انقلابی دور شروع ہوا۔ ہم جیسوں کے لئے اس کی ابتدا تحریک ہجرت سے ہو چکی تھی۔ میں نے بھی اپنا نام مہاجرین کے پہلے قافلہ کے لئے دیا تھا۔ مگر حسن اتفاق

کہ جس ہفتے قافلہ پشاور سے روانہ ہونیوالا تھا، میرے والد جنگ سے صحیح سلامت واپس آگئے اور میں شریک نہو سکا۔ کچھ دن بعد میں ایف۔ اے پاس کرکے بی۔ اے میں داخلہ لینے کے لئے علی گڑھ پہنچا اور ایم۔ اے او کالج کی دیرینہ روایات کے مطابق ایک "سینیر" طالب علم کا ساز و سامان فراہم کرنے یعنی عمدہ قسم کے نئے انگریزی سوٹ، پردے، فرنیچر، کپڑے وغیرہ بنوانے میں مصروف تھا کہ مولانا محمد علی کی رہائی کی خبر آئی۔ پھر تحریک خلافت کا غلغلہ شروع ہوا۔ تھوڑے دن بعد گاندھی جی کی شہرت ہوئی۔ اور ستیہ گرہ اور سوراج کا چرچا جگہ جگہ ہونے لگا۔ "ولایتی مال کا بائیکاٹ کرو۔" "انگریزی عدالتوں میں مقدمہ کی پیروی کرنا، انگریزی امدادی مدرسوں میں پڑھنا، انگریزی خطاب اور اعزاز قبول کرنا حتیٰ کہ انگریزوں کی نوکری حرام ہے۔" "کھادی پہنو، چرخہ چلاؤ، ستیہ گرہ کے لئے تیار رہو۔" "خلافت سوراج فنڈ میں چندہ دو، کانگریس کے ممبر بنو، سال بھر میں سوراج ملے گا۔ اہنسا شرط ہے۔" کس کا جی ایسے سودے پر نہ مچلتا۔ ستیہ گرہ میں شریک ہونیکے لئے مجھے ویسے بھی کسی تحریص کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ میں نے پرچار کا کام گاندھی جی اور محمد علی کی آمد سے بہت پہلے شروع کردیا۔ اور جب انگریز پرنسپل نے "والدین" کو بلاکر طالب علموں کو ہموار کرنے کی کوشش کی تو میں نے مراد آباد کے ایک "جذب الٰہی" رفیق کو اپنا والد قرار دیکر ترک موالات کی حمایت میں کالج کی مسجد میں تقریریں کرانا شروع کردیں اور ایک مہینہ تک کسی کو گمان نہوا کہ یہ حضرت میرے دوست ہیں والد نہیں ہیں۔

بالآخر ایک دن گاندھی جی اور گاندھی جی کے ساتھ مولانا آزاد، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، حسرت موہانی، آزاد سبحانی، ستیہ دیو غرض کانگریس اور خلافت کے سب ممتاز رہنما آن پہنچے اور ہم نے بلا اختلاف رائے کالج یونین میں ترک موالات کی حمایت کی تجویز منظور کی۔ اب ہمارا مطالبہ تھا کہ کالج حکومت سے امداد لینا بند کرے اور چونکہ کالج قوم کی ملکیت تھا، ہم اسکی عمارتوں پر قابض ہو گئے۔ چند دن کالج کی مسجد میں مولانا محمود الحسن کے مبارک ہاتھوں سے جامعہ ملیہ کی بنیاد پڑ گئی۔ یوں سمجھئے کہ ایم۔ اے او کالج کی چار دیواری میں دو جداگانہ کیمپ بن گئے۔ ایک میں کالج کے ٹرسٹی اور اساتذہ، دوسرے میں ہم تارکین موالات اور مولانا محمد علی۔ بالآخر ہمارے نکلوانے کے لئے انگریز کالج نے پولس سے مدد مانگی۔ حسرت کا مشورہ تھا کہ ہم پولس کا مقابلہ کریں۔ مگر دوسرے کانگریسی رہنما اسے اصول ستیہ گرہ کے خلاف سمجھتے تھے۔ غرضکہ ایک دن علی الصبح ہم سب پولس کی مدد سے بہ یک بینی و دو گوش کالج کے احاطے سے نکال باہر کردیئے گئے۔ اور سڑک پار ڈگی کے قریب یعنی کالج سے چند قدم کے فاصلہ پر ڈیروں میں رہنے لگے۔ بالفاظ دیگر اب میرے لئے جامعہ ملیہ کی زندگی کا نیا باب کھلا۔

ہماری زندگی کچھ انوکھی سی تھی۔ نام کے لئے جامعہ بھی یونیورسٹی تھی۔ بلکہ خود مولانا محمد علی ہمیں انگریزی اور تاریخ کا درس دیتے تھے۔ مگر اصل میں یہ ستیہ گرہی رضاکاروں کا کیمپ بلکہ پڑاؤ تھا۔ یہاں سے جتھے ملک کے مختلف حصوں میں جاتے تھے۔ دو چار جتھوں کے جانے کے بعد یہاں درس و تدریس کا

سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھوڑے دن بعد مولانا محمد علی نے اس کا نصاب بھی تیار کر لیا۔ مولانا محمد سورتی عربی پڑھانے کے لئے۔ خواجہ عبدالحیٔ تفسیر کے لئے۔ مولانا اسلم تاریخ کے لئے۔ مولانا شرف الدین اُردو کے لئے، مسٹر گیلاٹ انگریزی کے لئے۔ اور مسٹر سنگل کے گپتا گوہین کے لئے مقرر ہوئے اور یہ سب صحیح معنی میں اُستاد تھے۔ جامعہ میں تارکین موالات طالب علموں کا گروہ بھی خاصہ جمع ہو گیا۔ جس میں علیگڈھ کے علاوہ لاہور، پشاور، دہلی۔ حیدرآباد، آسام غرضکہ ہر جگہ کے نوجوان تھے۔ ان "پس ماندگان راہ" میں میں بھی شریک ہو گیا۔

میں اس زمانہ میں دو دوستوں کے ساتھ ایک کمرہ میں رہتا تھا۔ کلاس میں جانے کے لئے ہمارے پاس جامعہ کا سبز رنگ کا چوغا تھا۔ کھانا ہمیں ڈائننگ ہال میں ملتا تھا۔ ناشتہ کے لئے دو پیسے روز کی گاجریں میاں ٹونگی لے آتے تھے۔ ہماری مشترکہ ملکیت ٹین کا ایک بکس تھا۔ جس میں چار جوڑے کھادی کے کپڑے، ایک دو انگوچھے، دیوان غالب کا ایک نسخہ، محمد علی لاہوری کا قرآن کا انگریزی ترجمہ اور اردو زبان میں میرٹھ کے چھپے ہوئے کچھ قومی گیت تھے۔ میری انفرادی ملکیت میں ایک پرانی دری اور رزی کا ایک بارہ آنے والا جوتا شامل تھا۔ کھیل تفریح کے لئے جامعہ کا کھلا میدان اور کبڈی اور گلی ڈنڈا جس میں بزعم خود مجھے ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ جامعہ کے ماحول میں البتہ ایک خاص قسم کی کشش تھی جسے غالباً روحانی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے منصوبوں میں ترک و تجرید کو بھی دخل تھا۔ اس سلسلہ میں میری آنند مرحوم والی کہانی

دشوودانی (الہ آباد) میں غالباً ۱۹۴۰ء کے نمبر میں شائع ہوچکی ہے۔ اور میں یہاں اس دردناک داستان کی تفصیلات نہ دہراؤں گا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار ہم چند دوست ایک جوتشی کو ہاتھ دکھا کر مستقبل کا حال پوچھ رہے تھے کہ اُس نے رؤف پاشا کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ "تمہاری قسمت میں جہاز کا سفر ہے۔" کوئی دوسرا ہوتا تو شائد یورپ کے سفر کے خواب دیکھتا۔ مگر یہ جامعہ تھی۔ رؤف پاشا بے ساختہ بولے کہ "مجھے حج بیت اللہ نصیب ہوگا" اور مارے خوشی کے ناچنے لگے۔ عجب بات یہ تھی کہ رؤف باشا سے زیادہ غلام حسین روٹی والا مگن تھا۔ مگر ان کا قصہ سنانے سے پہلے میں ان کا تعارف کرادوں۔

غلام حسین اب بوڑھا ہو چلا تھا۔ ایک آنکھ بھی خراب تھی۔ مگر برسوں سے ایم۔ اے او کالج میں بسکٹ لاکر بیچا کرتا تھا۔ جس سال ترک موالات کا ہنگامہ شروع ہوا اس نے بدایون کے پیڑے بھی لانا شروع کر دیئے تھے۔ تھا بڑا دیندار اور نماز روزہ کا پابند چنانچہ جب ہم کالج سے نکالے گئے تو غلام حسین نے بھی ایم۔ اے او کالج سے قطع تعلق کر لیا۔ اور اب اس کا گزارہ صرف جامعہ کی غریب برادری کی بکری پر تھا۔ غلام حسین شہر میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اولاد میں صرف ایک بیٹی تھی جو جوان ہو چلی تھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی بیٹی نہ ہوتی یا بیٹی کی شادی ہوگئی ہوتی تو وہ یقینی ستیہ گرہ میں شریک ہو کر جیل خانہ چلا جاتا۔ غلام حسین کا معمول تھا کہ شہر سے اپنا بسکٹوں اور پیڑوں کا ٹوکرا لے کر وہ جامعہ کے کھلتے ہی آپہنچتا اور اسے برآمدہ کے ایک کونے میں رکھ دیتا۔ اب جس کا جو جی چاہے ٹوکرے میں سے لے اور جتنے پیسے چاہے اُس میں رکھ دے۔ نہ کوئی پوچھنے والا نہ دیکھنے والا۔

63919

کوئی کہتا کہ میاں غلام حسین تم بکری کا حساب کیوں نہیں رکھتے تو ہنس پڑتا اور کہتا کہ یہ مال سب ان لڑکوں کی خدمت کے لئے ہے حساب کس بات کا۔ غرضیکہ جب جوتشی نے رؤف پاشا کو جہاز کے سفر کی خوشخبری دی اور پاشا اسے حج بیت اللہ کی بشارت سمجھے تو فکر غلام حسین کو ئی کہ اس نوجوان کے مصارف حج کا انتظام کرنا چاہیئے۔ بالآخر چند ماہ بعد رؤف پاشا نے حج کا ارادہ کر لیا۔ مصارف کے لئے انہیں کوئی دقت نہ تھی۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ غلام حسین رؤف پاشا کے پاس ایک تھیلی سی لے کر آیا اور انہیں پیش کر کے کہنے لگا کہ میں نے زندگی بھر میں پانچ سو روپے جمع کئے ہیں آپ انہیں لے لیجئے۔ پاشا حیران کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ غلام حسین نے پھر کہا کہ ارادہ میرا بھی تمام عمر یہی تھا کہ میں بھی حج کروں چنانچہ میں نے ایک ایک روپیہ جوڑ کر یہ رقم اکٹھا کی ہے۔ مگر ایک تو میں بڈھا ہوں پھر میری بیٹی موجود ہے جسے چھوڑنا ناممکن ہے۔ اب آپ حج کو جا رہے ہیں تو میرے روپیوں سے حج کر آئیے۔ میں سمجھونگا کہ میں نے ہی حج کیا ہے۔ پاشا نے یہ نذر قبول نہیں کی تو غلام حسین آبدیدہ ہو گیا اور اس کے خلوص و محبت اور اس کی ناداری دیکھکر ہمارے دل بھی بھر آئے۔ سیاسی زندگی میں میں نے خلوص و قربانی کے بہت سے دعویدار دیکھے مگر غلام حسین جیسا مجھے نظر نہیں آیا۔ چند سال بعد جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے پاس پیسہ نہ تھا۔ البتہ یہ خوشی تھی کہ بیٹی کا نکاح ہو چکا تھا۔

۱۹۲۲ء کی وحشتنا کی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس لئے کہ ایک طرف گاندھی جی نے وطن پر چوری چورا کے تشدد کا الزام رکھ کر ستیہ گرہ کی تحریک دفعتاً روک دی تھی۔ دوسری طرف مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ترکی خلافت کا جنازہ نکل چکا تھا۔ اور ہم سب کٹی پتنگ کیطرح بے سنگ ڈھیل مارے مارے پھر رہے تھے۔ کہاں یہ امنگیں تھیں کہ سال بھر میں سوراج آئے گا اب آئے دن یہ حال ہو گیا۔ کہ کبھی اس ضلع میں ہندو مسلم فساد ہوا، کبھی اُس صوبہ سے کشت و خون کی خبریں آنے لگیں۔ تھوڑے دن بعد ان اضطراری ہنگاموں میں شدھی اور تبلیغ کی مرتب اور منظم وطن دشمن تحریکوں کا اضافہ ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ سیاسی اور سماجی مزاج نے مستقل طور پر وطن میں ڈیرے ڈال دیئے۔ نماز روزہ کی مجھے ویسے بھی عادت تھی، مگر اب ہلکے ہلکے انہماک اسدرجہ بڑھا کہ میرے دینیات کے اُستاد میرے مرشد بن گئے۔ اُن کا معمول تھا کہ پنج وقتہ نماز کے علاوہ تہجد کی نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ میں بھی اسمیں شریک ہونے لگا۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ میں چلّہ کشی کروں۔ اس کی کچھ شرطیں بھی تھیں مثلاً گوشت ترک کرنا، کامل طہارت اور اعتکاف۔ چلّہ میں ایک مخصوص دعا کا ۲۶ ہزار بار دہرانا بھی شامل تھا۔ میں شائد ان پابندیوں سے گھبرا کر ارادہ ترک بھی کر دیتا مگر چلّہ کے فضائل ایسے تھے کہ طبیعت مانتی نہ تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں درجہ بدرجہ نور خداوندی کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور شجر و حجر مجھ سے ہم کلام ہونے لگیں گے۔ لطف یہ کہ میری روحانی ترقی کا اندازہ مجھے خود اپنے خوابوں سے ہوتا رہے گا۔ میں اسکول کے زمانہ

میں ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت رسالت مآب کے دیدار سے مشرف ہو چکا تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ روحانی ارتقا کا یہ سلسلہ آئندہ جاری نہ رہے۔ غرضکہ میں نے پورے اعتماد اور کامل احتیاطوں کے ساتھ چلّہ شروع کیا۔ اور کامل طہارت کے خیال سے اپنا اُبلا ہوا کھانا خود پکانا شروع کر دیا۔ میں رات کو جو کچھ خواب میں دیکھتا یا دن میں جو کچھ میرے دل میں القا ہوتا مرشد سے بیان کر دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلے بارہ دن کوئی خاص بات بیان کرنے کے قابل نہ تھی۔ اطمینان قلب البتہ مجھے پورے طور پر حاصل ہو چکا تھا اور میں کبھی کبھی یہ بھی محسوس کرنے لگا تھا گویا کسی بڑے وجود میں سما گیا ہوں۔ مگر یہ تصورات اس درجہ مبہم اور غیر متعین تھے کہ مرشد سے ان کا بیان کرنا مشکل تھا۔ بالآخر تیرھویں شب کے اور آخر چودھویں کی صبح کو میں نے ایک واضح سا خواب دیکھا اور آنکھ کھُلتے ہی مرشد کو جا سنایا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنے عزیز دوست شنکر لال کے ساتھ گاؤں میں کلال کی دوکان پر بیٹھا دیسی شراب پی رہا ہوں اور ہم دونوں مست ہوتے جا رہے ہیں۔ بالآخر نشہ اتنا بڑھا کہ ہم دونوں زمین پر گر پڑے اور سو گئے۔ خواب بس اتنا ہی تھا اور میں نے جیوں کا تیوں سنا دیا۔ مرشد خواب سنکر ذرا دیر خاموش رہے پھر انہوں نے بعض سوالات پوچھے مثلاً میں نے کھانا کیا کھایا تھا؟ بدخوابی تو نہیں ہوئی۔؟ چلّے سے پہلے کسی سے عشق تو نہیں تھا؟ والد کی کمائی میں رشوت کا روپیہ تو شامل نہیں ہے؟ اتفاق یہ کہ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں تھا۔

پھر میرے بزرگ تھوڑی دیر کے لئے مراقبہ میں رہے اور اس کے بعد آہ سرد بھر کر فرمانے لگے کہ "روحانی ترقی تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔ تم چلّہ اور تہجد کا خیال چھوڑ دو۔ غالباً ازل سے ہی تمہارے نصیب میں شقاوت لکھی ہوئی ہے۔" آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کشف کے بعد میرے اوپر کیا گزری ہوگی۔ میں چار گھنٹے سے بھی کم سویا کرتا تھا۔ اور باقی وقت زیادہ تر کلام پاک کے مطالعہ اور مختلف قسم کی نمازوں اور وظیفوں میں صرف ہوتا تھا۔ بہر نوع جب دو چار دن کے غم و اندوہ کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے ہلکے ہلکے اپنا دامن روزے نماز سے چھٹانا شروع کیا۔ مگر اس میں برسوں لگ گئے اس لئے کہ کسی عادت کا ترک کرنا اس کے اختیار کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ البتہ سماجی زندگی کے بعض حقائق نے اس میں میری بڑی امداد کی۔

اس زمانہ میں آریہ سماج کے رہنماؤں کو دفعتاً خیال آیا کہ ہندوستان کی نومسلم آبادی کو از سرِ نو اپنے آبائی دھرم کی برکتوں سے روشناس کرانا چاہیئے۔ میں اتفاق سے یہی نہیں کہ راجپوت مسلمان ہوں بلکہ میرے بعض قریبی عزیز اب بھی ہندو ہیں اور جو مسلمان ہیں وہ بھی چھتری دھرم کی دیرینہ روایتوں کا لحاظ ضرور کرتے ہیں۔ چنانچہ میری ملکانہ برادری آج بھی "ادھ بریا" یعنی آدھی مسلمان آدھی ہندو کہلاتی ہے اور اسی رعایت سے میرے والد اور دادا کا ایک ہندو اور ایک مسلمان نام تھا۔ اس گمنام اور پسماندہ برادری پر اب دفعتاً آریہ سماج کی ہی نہیں بلکہ مختلف قسم کی اسلامی تبلیغی جماعتوں کی بھی توجہ مبذول ہوئی اور جگہ جگہ گردکل کے مہاشے اور مولانا لوگ

گشت کرنے لگے۔ مجھے ضلع آگرہ کے بعض عزیزوں سے سنہ ۲۳ء کے وسط میں
پتہ چلا کہ عنقریب موضع ساندھن میں بیک وقت ایک عظیم الشان سمیلن اور
ایک تبلیغی کانفرنس منعقد ہوگی جس میں ۵۰۰ کے قریب سوامی اور مہاتما اور ۵۰۰
سے زیادہ علمائے کرام تشریف لائیں گے اور یہ حضرات اس اجلاس کے بعد
ملکانہ دیہات میں اعلائے کلمۃ اللہ اور ویدک دھرم کا پرچار فرمائیں گے۔
مجھے ابتک اس کا گمان نہ تھا۔ کہ مذہب بھی ایک قسم کی تجارت ہے۔ اور مذہبی
افسانے جب انقلابی بیداری کے زمانے میں تراشے جائیں تو ان کی پشت پر
منظم رجعت پسند طاقتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اپریل ۲۳ء اس اجتماع کے موقعہ پر میں بھی ساندھن پہنچا۔ مگر مجھے اس سے
پہلے اپنی ننہیال کے علاوہ کسی ملکانے گاؤں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔
میری وضع یہ تھی کہ سر پر ترکی ٹوپی۔ بدن پر عمدہ شیروانی۔ پاؤں میں گرگابی
جوتہ اور موزے یعنی میں خالص شہری مسلمان معلوم ہوتا تھا۔ اچھنیرہ اسٹیشن سے
پیدل چل کر جب اس گاؤں کے پاس پہنچا تو کھیت میں ایک ٹھاکر صاحب نظر
پڑے اور میں آؤ دیکھا نہ تاؤ ان سے پوچھ بیٹھا کہ کیا آپکے علاقہ میں بعض لوگ
ہندو ہونا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پورے اطمینان سے فرمایا کہ ہاں۔ میں نے
پوچھا کیوں۔ فرمانے لگے کہ پہلے اورنگ زیب کا دباؤ تھا اور اجداد مجبوراً
مسلمان ہوگئے تھے۔ اب آزادی کا زمانہ ہے اور ہم اپنے قدیمی مذہب پر
واپس جانا چاہتے ہیں۔ بات ختم ہوئی اور میں اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ مگر اتنے
میں انہوں نے مجھ سے میرا وطن پوچھا۔ اور جب میں نے اپنے آبائی گاؤں کا نام

CENTRAL LIBRARY Malik Ram Collection Delhi

لیا تو وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر باپ کا نام دریافت کیا۔ میں نے نام ہی بتایا تھا کہ انہوں نے صرف یہی نہیں کہ میری ماں اور دادا، نانا، تایا، پھوپی وغیرہ کے نام گنا دیئے بلکہ مجھے بغل سے لگا کر فرمانے لگے کہ بیٹا میں تو تمہیں پردیسی مسلمان سمجھ کر بات کر رہا تھا۔ تم نے پہلے ہی اپنا پتہ اور نکاس کیوں نہ بتا دیا۔ میں نے اب اطمینان کا سانس بھر کر پوچھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ آپ کے گاؤں میں آبادی سے زیادہ پنڈت اور مولوی جمع ہیں۔ ٹھاکر صاحب اب اپنا حقّہ لے آئے اور ہنس کر فرمانے لگے کہ بیٹا ہم دن میں تو کسی کو اپنے کھیت پر آنے نہیں دیتے پر جب کام کاج سے فرصت ہو جاتی ہے تو شام کو نہا دھو کر حقّہ لیکر چوپال پر جا بیٹھتے ہیں۔ پھر کیا پوچھتے ہو۔ کہیں وید پڑھا جا رہا ہے کہیں قرآن کی تفسیر ہو رہی ہے۔ کوئی راجندر جی کا جیون چرتر سنا رہا ہے تو کسی نے حضرت علی کے کارنامے شروع کر دیئے ہیں۔ ہم جاہل ناخواندہ لوگ ہیں یہ کہاں نصیب کہ پڑھے لکھے لوگ ہمارے گاؤں میں آئیں اور ہمیں یہ سب عالموں کی باتیں بتائیں۔ ٹھاکر صاحب مزے لے لے کر کچھ اس طرح بیان فرما رہے تھے گویا یہ سب حضرات اُنکی تفریح کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یعنی مفت کا تماشہ جو ان کے اور ان کے عزیزوں کی تفنن طبع کے لئے اس دور دراز گاؤں میں ہو رہا ہے۔ میں ٹھاکر صاحب کو کیسے یقین دلاتا کہ آپ کی مجلس آرائی شہروں میں ہندو مسلمانوں کے فسادات بلکہ باہمی کشت و خون کا باعث ہے۔ بہرنوع یہ انکشاف مجھ پر محض عزیزداری کے باعث ہوا۔ کہ ہماری نگاہ میں تبلیغ اور شدھی جو بھی منصب رکھتی ہو ایک دن بھر کے تھکے ماندے اور محنتی کاشتکار

کی نگاہ میں اس کی حیثیت تفریح طبع سے زیادہ نہیں، بقول خود ٹھاکر صاحب کے "یہ سب ٹھلوؤں کے کام ہیں۔"

دوسرے مہینے میں اپنی ننہال میں گیا۔ یہ تحصیل ہاتھرس کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ میرے نانا کی چوپال پر قادیانی مولویوں نے مدرسہ کھول رکھا ہے اور بچے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب مجھ سے بڑے تپاک سے ملے اور جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ مجھے قادیانیوں سے کوئی تعصب نہیں ہے تو علحدہ لے جا کر فرمانے لگے کہ اب تم اپنے نانا سے سفارش کردو کہ اس چوپال پر جہاں مدرسہ ہے اور روزانہ باجماعت نماز ہوتی ہے، مسجد بنانے کی اجازت دیدیں بالآخر میں نے نانا سے مولوی صاحب کی خواہش بیان کردی اور اپنی طرف سے حمایت کے الفاظ بھی کہہ دیئے۔ شام کو میں اور قادیانی مولوی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ میرے نانا آ گئے اور خالص برج بھاشا میں فرمانے لگے کہ "مولوی صاحب۔ اب تک تو میں خاموش تھا۔ مگر جب آپ نے مسجد کی بات شروع کی ہے تو میں بھی کہہ ڈالوں۔ دیکھیئے جس ہفتہ آپ نے نماز پڑھنا شروع کی میری گائے مر گئی۔ پھر دوسرے مہینے جب آپ نے جماعت سے نماز پڑھنا شروع کردیا تو میری بڑی لڑکی بیمار پڑ گئی اور وہ اب تک بیمار چلی جاتی ہے۔ اب آپ ہی سوچیئے کہ جب خدا ہم سے ذرا دور ہے تو یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور اگر اس کا گھر ہی یہاں بن گیا (یعنی مسجد) تو پھر وہ سب کو مار ڈالے گا۔ ایک ہم میں سے زندہ نہ بچے گا۔"

اب مولوی صاحب پریشان تھے کہ ٹھاکر صاحب کو کیسے سمجھائیں

بالآخر انہوں نے نماز چوپال پر پڑھنا بند کر دی اور باہمی صلح ہو گئی۔ مسجد اس گاؤں میں اب تک نہیں ہے۔

میں ابھی اس گاؤں میں ہی تھا کہ عید آ گئی اور میری خوش نصیبی کہ والد صاحب بھی عید سے ایک دن پہلے آ پہنچے۔ چنانچہ طے ہوا کہ نماز نہر کے پاس کھیت میں پڑھی جائیگی۔ قریب ہی لاکھنو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں کے ایک سنی حنفی امام بھی عید کی نماز پڑھانے پر راضی ہو گئے۔ دوسرے روز ہم پچاس کے قریب آدمی کھیت میں جا پہنچے، امام نے الٹی سیدھی نماز پڑھا دی اور ہم گاؤں واپس آنے کے لئے تیار ہو گئے کہ اتنے میں میں نے دیکھا کہ والد صاحب میرے ماموں پر خفا ہو رہے ہیں۔ قصور یہ تھا کہ غریب نے چلتے وقت کھیت میں کہیں مہادیو کا بت تھا، اس پر بھی دو پھول توڑ کر چڑھا دیئے تھے۔ والد صاحب فارسی اور عربی پڑھ چکے تھے۔ پھر شہر میں رہائش تھی چنانچہ ان پر شریعت کا غلبہ ہو چلا تھا۔ وہ صرف یہی نہیں کہ داڑھی رکھتے تھے بلکہ دوسروں کو فہمائش کرتے رہتے تھے۔ بت کی پرستش ان کی نگاہ میں شرک اور گناہ عظیم تھا۔ اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس معاملہ میں ماموں کی کوتاہیوں پر پردہ ڈال دیتے۔ غرضکہ ان کی تنبیہ اور خفگی دیکھکر دوسرے لوگ بھی ادھر متوجہ ہوئے۔ ان میں ایک دو بزرگ اور معمر آدمی تھے۔ اور قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اسلام کے معبود کے ساتھ ساتھ ہندو دیوتا سے بھی عقیدت رکھتے ہیں۔ بالآخر جب انہوں نے دیکھا کہ والد صاحب ہیں کہ مانتے ہی نہیں تو ان میں سے ایک بڈھا انہیں علحدہ ایک طرف لے گیا۔ میں بھی ساتھ ہو لیا اور اب

دونوں میں مکالمہ یوں شروع ہوا۔ والد صاحب نے کہا کہ بت کا پوجا شرک اور گناہ ہے۔ بزرگ نے اُن سے پوچھا کہ تمہیں مرنے کے بعد کا حال کیسے معلوم۔ کیا کوئی مرنے کے بعد واپس آیا ہے؟ والد صاحب اس سوال پر ذرا خاموش تھے۔ کہ گاؤں کے بزرگ نے دیوتا کی طرف دور سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ اگر کہیں مرنے کے بعد تمہارے خدا کی جگہ یہ سچ نکلا تو پھر کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں والد صاحب نے پھر اپنا اسلامی عقیدہ دہرایا مگر بزرگ کے سوال کی خاطر خواہ تردید نہ کر سکے۔ بالآخر گاؤں کے بزرگ نے فصیح برج بھاشا میں والد کو نصیحت کی کہ جب مرنے کے بعد پتہ نہیں کہ کیا ہوگا تو بہتر یہی ہے کہ دونوں کو خوش رکھا جائے۔ "بتو نائیں کہ داؤ ناگون کام آئے جا"۔ میں نے بڑے غور سے بوجھ بجھکڑ کا مشورہ اور باتیں سنیں اور بالآخر مجھے دیہات کے لوگوں کی خوش مذاقی اور دور اندیشی کا دل سے اعتراف کرنا پڑا۔

(۳)

جامعہ چھوڑنے کے بعد میری زندگی میں ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آیا یعنی مہاراجہ الور سے میری ملاقات بلکہ دوستی ہو گئی۔ اس کی وجہ بہت ہو سکتی تھیں۔ اول تو میرے اجداد الور کے قدیمی باشندے ہیں پھر اُن میں سے بعض ریاست کے عہدوں پر ملازم رہے تھے۔ مگر سرسری ملاقات اور دوستی کی وجہ مسلم یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ اس سرسری ملاقات کے بعد مہاراج نے

مجھے گرمی کی تعطیلات میں الور آنے اور شیر کے شکار میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس سے آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مجھے شکار سے کوئی دلچسپی ہے۔ یا میں نے کبھی بندوق چلائی ہے۔ بہر نوع میں دو تین مہینے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں مہاراج کے ساتھ دیجے مندر اور سرسکا محلوں میں رہا اور میں کھلے دل سے اس کا اعتراف کروں کہ پہلی ملاقات میں مہاراجہ جے سنگھ مجھے بہت بھائے۔ میں ہندو مسلم تفرقہ سے دل برداشتہ، یہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی بلکہ مسلک "صلح کل" پر عامل۔ میں مذہب کی رسموں سے متنفر، یہ روح تصوف و ویدانت کے دلدادے۔ مجھے برطانوی حکومت سے بغض، یہ دبی زبان سے ہندوستانی سوراج کے حامی اور بیماری کے زمانہ میں مولانا محمد علی کا علاج کرا رہے تھے۔ مجھے معاً یہ محسوس ہوا کہ میرا آبائی وطن الور اور اس کا حکمران خود میرے جذبات وطن پرستی و آزادی کا ترجمان ہے اور اگر اس اندازہ میں کوتاہی تھی تو مولانا محمد علی کی قصیدہ خوانی اور مدح سرائی نے پوری کر دی۔ غرضکہ ایم۔ اے ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد میں دوبارہ الور پہنچا۔ تو مہاراجہ کا اصرار تھا۔ کہ اب مجھے ریاست میں ملازمت اختیار کرلینی چاہیئے۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ میں سردست دو سال انگلستان میں تعلیم حاصل کروں چنانچہ میں ۱۹۲۷ء میں لندن جاکر بیرسٹری کے لئے لنکنس ان (Lincoln's Inn) میں اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے علوم شرقیہ کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ خوش نصیبی سے میرے نگراں سر ڈزلی ہیگ مقرر ہوئے جو اعلیٰ پایہ کے مورخ ہونیکے علاوہ الور میں رہے تھے۔ اور مہاراجہ سے ذاتی طور پر واقف تھے۔

مجھے لندن میں رہتے سال بھر سے کچھ ہی زیادہ ہوا ہو گا کہ مہاراج کے مشیر خاص راؤ راجہ امر سنگھ مہاراج کی جوبلی کی دعوت کے سلسلہ میں انگلستان مہمانوں کو بلانے کے لئے وارد ہوئے اور مولانا محمد علی اور میں دونوں اس موقعہ پر اور پہنچے۔ مولانا اس زمانہ میں میرے ساتھ لندن میں رہے تھے۔ مہاراج ہم دونوں پر مہربان تھے چنانچہ ہم دونوں سرکاری محل میں کچھ دن ساتھ رہے۔ جب جوبلی کا زمانہ قریب آیا تو مہاراج نے مجھے ہندوستانی مہمانوں کا (جس میں بیشتر راجہ اور نواب قسم کے لوگ تھے) نگراں مقرر کر دیا۔ ان معززین کے کھانے کا ایک انگریزی کمپنی کو ٹھیکا دے دیا تھا اور ہم فی کس ۵۲ روپئے روزانہ انہیں دو وقت کے کھانے کے لئے ادا کرتے تھے۔ ان کی تفریح کیلئے ہم نے ایک تھیٹر کو بھی دعوت دی تھی جسے ۶۵۰۰۰ ہزار روپئے پیشگی ادا کر دیئے گئے تھے۔ آپ کو اخراجات کا اس سے اندازہ ہو گا کہ ہم نے جوبلی کی رسموں پر تین دن میں تیس لاکھ خرچ کیا جو ریاست کی سالانہ آمدنی سے کچھ ہی کم تھا۔ مجھے البتہ پہلی بار اس جاگیری نظام اور حکمرانوں کا تجربہ ہوا جنہیں میں اور کانگریسی رہنما قومی آزادی اور خودداری کا ترجمان سمجھتے تھے۔

جوبلی کے ان تین دنوں میں میرا معمول تھا کہ میں شام کو ہر رئیس کے خیمہ پر حاضر ہوتا اور ان سے دریافت کرتا کہ انہیں اور ان کے عملہ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ میں حسب معمول راجپوتانہ کے ایک مشہور حکمران کے شامیانہ پر حاضر ہوا۔ موصوف بہ نفس نفیس خود تشریف فرما تھے۔ میں نے مودبانہ دریافت کیا کہ حضور کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ فرمانے لگے کہ مجھے ہر قسم کی راحت نصیب

ہے البتہ رات کا انتظام کافی نہیں ہے۔ میں سمجھا کہ جاڑے کا موسم ہے شاید کوئلہ یا بجلی کافی نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ اس کی شکایت نہیں ہے۔ رئیس نے دوبارہ فرمایا کہ رات کا خیال رکھیئے۔ ابکی بار میرا دھیان سامان نوشیدنی پر گیا۔ میں سمجھا کہ شاید شراب کی ضرورت ہو۔ پتہ چلا کہ اس کی بھی فراوانی ہے۔ جب انہوں نے تیسری بار وہی فقرہ دہرایا تو بالآخر میں تاڑ گیا کہ انہیں ایک حسینہ کی رات کو ضرورت رہتی ہے۔ اور ہمارے فرائض منصبی میں اس کی فراہمی بھی شامل تھی۔ مجھے معذرت کرنا پڑی کہ اس کوتاہی کی تلافی مشکل ہے۔ صرف دو دن اور صبر فرمایئے پھر اپنی ریاست میں پہنچ جایئے گا۔ البتہ مجھے خود اپنے مستقبل کے منصوبوں کو دہرانا پڑا

جوبلی جشن کا غالباً تیسرا دن تھا کہ میں اور مہاراج ان کی نئی ہسپانوی سوئیزا گاڑی میں ۹ بجے تندر محل سے شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ خود مہاراج موٹر چلا رہے تھے۔ اور تیسرا کوئی اور ہمارے ساتھ نہ تھا۔ محل سے نکلے ہی تھے کہ مہاراج نے ایکسیلریٹر دبایا اور موٹر ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگی۔ مہاراج بالعموم اسی رفتار سے موٹر چلاتے تھے سڑک سیدھی اور صاف تھی۔ دونوں طرف سرکاری باغات کی مٹی کی چار دیواری نظر آتی تھی۔ دور سڑک پر بیچ میں ایک باوردی کانسٹبل کھڑا ہوا ہمیں اشارہ دے رہا تھا کہ چلے آؤ۔ صورت یہ تھی کہ اگر مہاراج کانسٹبل سے بچکر چلتے ہیں تو موٹر کے مڈگارڈ کا باغ کی چار دیواری سے رگڑ کھا کر خراب ہو جانے کا ڈر ہے۔ اگر باغ سے بچتے ہیں تو کانسٹبل کی زندگی اندیشہ میں ہے۔ میں یوں بھی تیز موٹر کا عادی نہیں ہوں۔ میری نگاہ راستے پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے آناً فاناً میں صرف یہ دیکھا کہ ہم کانسٹبل کو روندتے ہوئے ۸۰ میل کی رفتار

سے گزرے۔ مہاراج نے بس ایک نظر مڑ کر لاش کو دیکھا۔ اور واپسی پر بیوہ کے لئے ۵ روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ شہر کے دہرما تما لوگوں نے البتہ مہاراج کی دریا دلی اور انسان دوستی کی داد دی۔

جوبلی کے دو ہفتے بعد میں مہاراج کا مشیر خاص اور سرکاری مہمان خانہ اور محلوں اور بھنڈاروں کا نگراں مقرر ہو گیا۔ تقریباً ۵۰۰ آدمیوں کا عملہ میرے ماتحت کام کرتا تھا۔ اس میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ منشی، محرر، پہرے دار، فراش، صفائی والے، بھنڈاری وغیرہ۔ ایک دن شکایت آئی کہ مہمان خانہ کا ایک فراش اپنے کام پر بروقت نہیں آتا۔ عمارت میں سوتا ہوا پایا جاتا ہے۔ جرم سنگین معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پیشی کا حکم صادر کر دیا۔ یہ فراش جب میرے دفتر میں داخل ہوا تو میں بلا ارادہ ادب سے کھڑا ہو گیا۔ خیر تھی کہ کوئی دوسرا آدمی کمرہ میں نہ تھا۔ عمر ۸۰ برس کے قریب، داڑھی سفید، بدن میں رعشہ۔ مجھے اپنے بوڑھے دادا اور ان کی نورانی صورت یاد آ گئی۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے اپنی کوتاہیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ "جی ہاں۔ مجھ سے خطا ہوئی۔ دراصل مجھ سے زیادہ دیر کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ میرے لئے جھکنا یا بوجھ اٹھانا بھی مشکل ہے۔ ہانپنے لگتا ہوں۔" میں نے بڑے میاں سے بالآخر کہا کہ آپ ملازمت چھوڑ کر اللہ اللہ کیوں نہیں کرتے۔ اس پر بڑے میاں رونے لگے اور انکی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ بولے۔ سرکار میرے پاس تو کل کے کھانے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ عمر کتنی ہے۔ جواب ملا کہ ۸۰ سے اوپر۔ تنخواہ؛ معلوم ہوا کہ دس روپے ماہوار۔ مدت ملازمت؛ فرمانے لگے کہ مجھے فراش کا کام کرتے ۲۵ سال ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد میں نے مزید سوالات کرکے اُن کا دل نہیں دُکھایا البتہ چند دن بعد جب مہاراج شیر کے شکار کے لئے سرسکا روانہ ہوئے تو ان کی باربرداری کا اہتمام کرکے میں نے بیماری کا بہانہ بنایا اور جب سرکار روانہ ہوگئے تو میں دوسرے دن اَلورسے علی گڑھ واپس آگیا۔

(۴)

سنہ ۲۹ء کے آخر میں میں دوبارہ لندن وارد ہوا۔ میری زندگی کے غالباً یہ سب سے مسرت انگیز دن تھے اس لئے کہ اب افسانے سب ختم ہوچکے تھے۔ اور میں " تراشیدم، پرستیدم، شکستم " کی منزلوں سے گذر چکا تھا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ جب میں مہاراج کا فرستادہ آیا تھا تو میرے پاس ضرورت سے بہت زیادہ روپئے رہتے تھے۔ اب میری ماہانہ آمدنی سَو روپیہ ماہوار تھی۔ جو کسی صورت سے کافی نہ تھی اور مجھے ایک وقت کا کھانا اور چائے ترک کرنا پڑی۔ مگر ہزار روپئے ماہوار کی آمدنی سے زیادہ میری وہ دولت تھی جو سماجی اور ذہنی معتقدات کی صورت میں مجھے نصیب ہوئی۔ میں نے یوں بھی پہلے سرہنری آس آینگر، مولانا محمد علی اور سکلتوالا کے ساتھ لندن کانگریس کمیٹی کے قیام میں حصّہ لیا تھا۔ اب لندن آتے ہی میں اُن رفیقوں سے ملا جو میری طرح فاقہ مستی میں دن گزارتے تھے اور مجھ سے بہت پہلے اوران دلخراش اور عبرت انگیز تجربوں سے دوچار ہوئے بغیر ہی ایک حکیمانہ فلسفہ زندگی تک پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ دوسرے اتوار کو ہم

سب لوگ پہلے شاپور جی سکلتوالا کے مکان پر اور وہاں سے واپسی پر ہائی گیٹ کے قبرستان میں پہنچے اور یہاں ایک نئے مرشد کے مزار پر وہ عہد کیا جو ابھی تک باقی ہے۔ میری زندگی کا یہ دور نیا اور ماضی سے بالکل مختلف تھا۔

پنڈت سندر لال

۱۸۹۱ء کی بات ہے میری عمر کا پانچواں سال تھا۔ الف، ب، ت شروع کرنے کا دن آیا۔ دادا بزرگوار زندہ تھے، خاندان کے رواج کے مطابق جب کسی لڑکے کی تعلیم شروع کرائی جاتی تھی تو مولوی صاحب آتے تھے 'بسم اللہ' سے آغاز ہوتا تھا۔ مولوی صاحب ہاتھ پکڑ کر تختی پر ا، ب لکھواتے تھے۔ انھیں عیدی پیش کی جاتی تھی، سھائی نذر کی جاتی تھی، مٹھائی بٹتی تھی وغیرہ۔ یہ رواج چند صدیوں پرانا ہی رہا ہوگا۔ دادا بزرگوار نے ایسا ہی طے کیا۔ پر میرے والد ماجد پر کچھ دوسرا رنگ چڑھ چکا تھا، والد نے چاہا کہ بچہ کی تعلیم شروع کرانے کے لئے پنڈت جی آئیں۔ شری گنیشایہ نمہ' سے شروع کیا جائے۔ اور تختی پر پہلے

ناگری میں "اے، آ" لکھایا جائے۔ باپ بیٹوں میں اختلاف ہوگیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ جس دن ساعت دیکھ کر میری تعلیم شروع ہوئی، اُسی دن پہلے صبح کو مولوی صاحب آئے، انھوں نے بسم اللہ سے ساری رسم ادا کی۔ میں نے انھیں عیدی پیش کی، اُنھوں نے مجھے مٹھائی کھلائی۔ اور اس کے بعد سہ پہر کو پنڈت جی تشریف لائے، اُنھوں نے شری گنیش آیہ نمہ سے اپنی رسم ادا کی۔ مجھے "اے، آ" لکھنا سکھایا اور مٹھائی کھائی اور کھلائی۔

اُس دن سے لیکر تقریباً دو سال تک یہی ہوتا رہا کہ روز صبح کو مولوی صاحب آتے تھے۔ میں اردو پڑھتا تھا۔ شام کو پنڈت جی آتے تھے، میں اُن سے ہندی پڑھتا تھا۔ دو سال کے اندر میں ایک طرف تو گریا پڑھ رہا تھا، اور دوسری طرف تلسی داس جی کی رامائن کا سندر کانڈ، گریا مجھے قریب قریب حفظ ہوگئی تھی اور سندر کانڈ کی بہت سی چوپائیاں بھی زبانی یاد تھیں۔ انگریزی پڑھنا میں نے ۱۸۹۳ء میں شروع کیا۔

ایک عرصہ کے بعد گاندھی جی سے ہندوستان کی مشترکہ کلچر، خاص کر ہندو مسلم کلچر پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ گاندھی جی بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ اسی گفتگو کے دوران میں ایک دن گاندھی جی سے میری تعلیم شروع ہونے کے اس واقعہ کا ذکر آیا۔ گاندھی جی نے اس سارے قصے کو غور سے سنا اور پھر مجھ سے کہا۔ "اب میں سمجھا تمہارے اندر یہ کامن کلچر کی بات کیسے آئی۔"

گاندھی جی کی بات تو سچ تھی ہی پر میں اتنا جانتا ہوں کہ شیخ سعدی کی دانشمندی سے بھری ہوئی نصیحتوں اور تلسی داس جی کے بیش قیمت اُپدیشوں دونوں کی قدر میرے

دل میں اسی وقت سے چلی آ رہی ہے اور آج تک موجود ہے۔
رامائن بہت ضخیم چیز تھی، ۱۸۹۳ء سے پہلے میں اُسے ختم نہ کر سکا، لیکن کریا چھوٹی چیز تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُسے ختم کرنے کے بعد میں نے گلستاں شروع کی تھی۔

میری عمر آٹھ نو سال کی رہی ہوگی، مجھے اتنا یاد ہے کہ اُن دنوں میں اپنی دادی کے ساتھ ایک ہی لحاف میں سویا کرتا تھا۔ کہیں سن لیا کہ جس کے کان چھوٹے ہوتے ہیں وہ جلدی مرتا ہے۔ دن میں کسی وقت ماں کے کانوں کی طرف میری نگاہ گئی۔ میری ماں کے کان چھوٹے تھے۔ میں سہم گیا کہ میری ماں جلد مرجائے گی۔ بہت پریشان ہوا۔ سوچا پہلے یہ طے کرنا چاہیئے کہ موت کیا ہے۔ طے کر لیا کہ گھر سے بھاگ کر پہاڑ پر جاکر کسی سادھو سے ملا جائے۔ اور اس کا چیلہ بنا جائے۔ میں نے گھر پر کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہی۔ سردی کے موسم میں ایک دن چپکے سے ایک کمبل، ایک لوٹا اور تلسی کرت رامائن سرہانے رکھ کر سو گیا۔ غالباً اسی تشویش میں نیند بھی نہ آئی ہوگی۔ کچھ رات گئے جب معلوم ہوا کہ گھر کے لوگ سب سو گئے ہیں، چپکے سے اٹھا۔ بستر سے نکلا، اس طرح کہ دادی کو نہ معلوم ہونے پائے۔ کمبل کندھے پر اور لوٹا اور رامائن ہاتھ میں لئے ہوئے کمرے کے باہر نکلا زینہ اتر کر چپکے سے دہلیز تک پہونچا۔ صدر دروازہ کھولنا چاہا۔ خوش قسمتی سمجھئے یا بدقسمتی، دروازے کے بیچ کا ڈنڈا بہت بھاری تھا ٹس سے مس نہ ہو سکا۔ اتنے میں دادی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مجھے

چار پائی پر نہ دیکھ کر آوازیں دینا شروع کیا۔ تلاش ہوئی۔ والد ماجد اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک منہ تھپڑ کھا کر میں پھر اپنے بستر پر پہنچ گیا۔ پہاڑ پر جا کر سادھو بننے اور موت کو سمجھنے کا خبط تو شاید اسی دن ختم ہو گیا۔ لیکن جہاں تک میں قیاس کر سکتا ہوں اس کے کچھ عرصے بعد میرا پہلے آریہ سماجی بننا، دونوں وقت بلاناغہ سندھیا کرنا، پھر اس سے تسلی نہ ہونے پر تھیا سوفیکل سوسائٹی کا ممبر ہونا، مسز اینی بیسینٹ کے قدر دانوں میں شامل ہونا، کم از کم ایک ہزار مرتبہ گیتا کو شروع سے آخیر تک پڑھنا، دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ آخیر میں برسوں بعد کبیر صاحب کی بانی کو پڑھ کر انہیں اپنا گورُو ماننا اور پھر مولانا روم کی مثنوی جیسی قوت کی کتابوں میں غوطے لگانا، یہ تمام چیزیں مجھے اسی ایک سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ مذہب کی تلاش نے ہی مجھے تمام اصطلاحی مذاہب سے اوپر اٹھایا۔ آج میں اپنے آپ کو مذہب کا ماننے والا سمجھتا ہوں۔ وحدت الوجود کا قائل ہوں۔ کبیر صاحب کو اپنا گورو مانتا ہوں اور اس مذہب عشق کا شیدائی ہوں جس کی بابت مولانا روم نے کہا ہے :-

مذہبِ عشق از ہمہ ملّت جُدا است،
عاشقاں را مذہب و ملّت خدا است

دنیا کے اصطلاحی مذہبوں سے اوپر اٹھنے میں مجھے سب سے زیادہ مدد کبیر صاحب کی بانی اور مولانا روم کی مثنوی کے بعد ہربرٹ سپنسر کی پرنسپلس آف سوشیولوجی سے ملی ہے۔

۱۹۰۵ء کی روس جاپان جنگ کے بعد تقریباً تمام ایشیا کے پڑھے

لکھے لوگوں کا دھیان جاپان کی طرف گیا۔ جاپان جیسی چھوٹی سی ایشیائی قوم کا یورپ کی سب سے بڑی جنگی طاقت روس کے مقابلہ میں ڈٹ جانا اور اس کے چھکے چھڑا دینا ایک معمولی بات نہ تھی۔ تمام ایشیا میں اُس سے نئی امیدیں جاگ اٹھیں۔ ہندوستان پر بھی بہت بڑا اثر ہوا۔ جاپان کی پچھلی تواریخ بھی خوب پڑھی جاپان کی تواریخ کے دو چھوٹے چھوٹے واقعوں نے مجھ پر اور مجھ جیسے بہت سوں پر بڑا اثر کیا۔

پہلا واقعہ یہ تھا۔ ۱۸۵۲ء تک یورپ کی کوئی قوم سوائے ڈچ کے جاپان کے ساتھ تجارت نہ کر سکتی تھی۔ ڈچ تاجر بھی صرف ایک چھوٹے سے ناپوسشیما میں جاکر اپنے مال کا لین دین کر سکتے تھے۔ باقی تمام یورپین قوموں کے لئے جاپان کے دروازے بالکل بند تھے۔ ۱۸۵۲ء میں ایک امریکی جہازی بیڑا کوموڈور پیری Perry کے ماتحت جاپان پہنچا۔ کوموڈور پیری Commodore Perry نے اپنے بیڑے کے بل پر جاپانی سرکار سے کہا کہ ہمارے ساتھ تجارت کرنے کیلئے اپنے دروازے کھول دو۔ جاپان بھر میں تہلکا مچ گیا۔ آپس میں صلاح کرکے جاپان کے رہنماؤں نے غور کرنے کیلئے ایک سال کا وقفہ مانگا۔ کوموڈور پیری نے منظور کر لیا اور ایک سال بعد واپس آنے کا فیصلہ کرکے امریکہ واپس چلا گیا۔ وہ سال جاپان میں ایک زبردست بے چینی کا سال تھا۔ منجملہ اور کوششوں اور تیاریوں کے جاپانیوں نے طے کیا کہ جاپان کے تمام ساحل کے برابر برابر نئی قلعہ بندیاں کر لی جاویں اور خاص خاص مقاموں پر توپیں لگادی جاویں تاکہ ضرورت پڑنے پر ملک کی حفاظت کی جا سکے۔ ہزاروں توپوں کے ڈھلنے کا حکم ہوا۔ اِن توپوں کے لئے تانبے کی ضرورت ہوئی۔ تانبا اس وقت تک جاپان میں بہت کم ہوتا تھا۔ کچھ تانبا یورپ سے ڈچ تاجروں کی معرفت

آنا تھا۔ ڈچ تاجروں سے تانبے کی فرمائش کی گئی۔ عین اُس نازک وقت پر ڈچ تاجروں نے جاپانیوں کے ہاتھ تانبہ بیچنے سے انکار کر دیا۔ جاپان کے لیڈروں نے وہاں کی تمام جنتا سے اپیل کی۔ لاکھوں گھروں سے لوگوں نے اپنے استعمال کے برتن اور طرح طرح کی دھات کی بنی چیزیں سرکار کے حوالے کر دیں۔ کہ انہیں گلا کر دیش کی حفاظت کے لئے توپیں ڈھالی جا سکیں۔ پھر بھی شاید دھات کی کمی رہی۔ دیش بھر کے بودھ پروہتوں اور مٹھادھیشوں کی ایک سبھا ہوئی۔ انہوں نے ایک رائے سے یہ تجویز پاس کی کہ ماکڑا کی بُدھ کی عالی شان مورتی جیسی کچھ خاص خاص پُرانی مورتیوں کو چھوڑ کر جو کلا کی نگاہ سے بھی اونچے درجہ کی تھیں باقی سب بودھ اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں، گھنٹے، گھڑیال اور طرح طرح کا پوجا کا سامان مندروں سے نکال کر سرکار کے حوالے کر دیا جائے تاکہ انہیں گلا کر دیش کی حفاظت کیلئے توپیں ڈھل سکیں۔

ایک جاپانی پروہت نے سبھا میں کہا۔" ہمارے سامنے سوال بڑا سیدھا ہے۔ اگر دیش ہاتھ سے نکل گیا تو یہ مورتیاں بھی کہاں بچیں گی اور اگر دیش بچ گیا تو مورتیاں پھر ڈھل سکتی ہیں۔"

۱۸۵۲ء کے اس واقعہ کو ۱۹۰۵ء کی جنگ کے بعد جب کسی ہندوستانی نے پڑھا یا سُنا اس کے دل پر اس وقت اس کا گہرا اثر ہوا۔ ہزاروں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ پوجا پاٹھ اور اوپری ریت رواج کے مقابلہ میں ملک کی آزادی کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ مجھ پر بھی اس کا کافی اثر تھا اور میں نے اس واقعہ کو اپنی سیکڑوں تقریروں میں دہرایا ہوگا۔

جاپان کی تواریخ کا ہی ایک دوسرا چھوٹا سا واقعہ تھا جس نے اُن دنوں میرے اور مجھ جیسے بہت سے ہندوستانی نوجوانوں کے دِل پر اثر کیا۔

وہ یہ تھا۔ جس طرح ہندوستان میں ہندو مسلم سوال تھا اسی طرح جاپان میں بودھ عیسائی سوال تھا۔ بودھوں کی تعداد زیادہ۔ عیسائیوں کی کم۔ پر اتنی کم نہیں کہ نظر انداز کی جا سکے۔ عیسائی مذہب وہاں تین چار سو برس سے پھیل رہا تھا۔ جاپان کی کچھ چھوٹی موٹی ریاستوں میں اکثریت تک عیسائیوں کی ہو گئی تھی۔ کسی کسی ریاست کے حکمران تک عیسائی تھے۔ فوج میں بڑے بڑے عہدوں پر عیسائی موجود تھے۔ یورپ والوں نے اِس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ جاپان کے بودھ اور سب طرح کا گوشت کھاتے تھے لیکن گائے کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے ایک جاپانی سنت پہلی زمانے گائے کی سواری کیا کرتے تھے۔ تب ہی سے گائے بھی جاپان میں پجنے لگی تھی۔ اسی لئے گائے کے گوشت سے پرہیز تھا۔ وہاں کے عیسائی بھی بودھوں کی دیکھا دیکھی یا پرانی عادت کے مطابق گائے کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے۔ اب یورپ کے کچھ پادریوں نے جاپان کے عیسائیوں کو سمجھانا شروع کیا کہ تم اس وہم میں کیوں پڑے ہوئے ہو۔ تمہارے مذہب میں سب جانور برابر ہیں وغیرہ۔ کچھ عیسائی گائے کا گوشت کھانے لگے۔ جگہ جگہ گائے ذبح ہونے لگی۔ بودھوں نے اعتراض کیا۔ کہیں کہیں بودھوں اور عیسائیوں میں جھگڑے ہو گئے۔ بالکل ہندوستان کی سی حالت۔ ڈر تھا کہ معاملہ بڑھ جائے۔ اور مستقل قومی بیماری کی شکل لے لے جاپان کے بودھ پروہتوں اور شہزادوں نے پھر اس کا ایک انوکھا حل نکالا۔ اُنکی ایک سبھا ہوئی۔ کافی بحث کے بعد یہ

تجویز پاس ہو گئی کہ گائے کے خاص احترام کا بودھ مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور کچھ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ گائے کے گوشت کے استعمال سے یورپ والوں میں ہمت اور طاقت بڑھی ہے۔ اس لئے سب بودھ لوگ آزاد ہیں کہ اگر گوشت کھانا چاہیں تو انہیں کسی جانور سے پرہیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سارے سوال پر بودھ عالموں میں دو رائیں پھر بھی بنی رہیں۔ لیکن بودھ پراہتوں کی اس تحریک کا ایک نتیجہ فوراً یہ ہوا کہ وہ سوال بودھ عیسائی سوال ہونے سے بچ گیا۔ آج جاپان کے لوگ مذہبی بنا پر کسی جانور سے کوئی پرہیز نہیں کرتے۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۵ء تک کے درمیان اس جاپانی واقعہ کی ہندستان کے کچھ پڑھے لکھوں میں خوب چرچا ہوتا تھا۔ کچھ عجیب عجیب کوششیں بھی ہوئیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۵ء میں تقریباً اسی بنا پر ایک ہندو مسلم اتحاد انجمن بھی قائم ہوئی تھی۔ کچھ بڑے بڑے لوگ جن کے ناموں سے ملک واقف ہے اس کے ممبر تھے۔ پر اس معاملے میں جلدی ہی کچھ بے تکاپن دکھائی دینے لگا۔ اس لئے میں اُس انجمن کا زیادہ ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے یہ واقعہ صرف اس لئے لکھا ہے کہ اس کا اُن دنوں میرے دل و دماغ پر ایک خاص اثر ہوا۔

۱۸۶۲ء تک جاپان میں چھوٹی بڑی تقریباً پونے تین سو آزاد ریاستیں تھیں جو بالکل ہندستان کے چھ سو رجواڑوں سے ملتی ہوئی تھیں۔ جاپانیوں کو کس طرح اُن کثیر تعداد رجواڑوں سے خطرے کا امکان دکھائی دیا اور کس طرح چند رہنماؤں کے سمجھانے اور مثال قائم کرنے پر اُن سب جاپانی رجواڑوں کے موروثی حکمرانوں نے اپنے کو اور اپنی گدیوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے ملک کو

ایک ہو جانے کا موقعہ دیا۔ اس کا اثر بھی بہت سے ہندستانی محبّانِ وطن پر پڑا۔ اور مجھے یقین ہے کہ سنہ ۱۹۴۷ء میں ہماری ملک کی چھ سو ریاستوں کے ختم ہونے کا اُس پہلے کے جاپانی تجربے سے کافی تعلق تھا۔

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے آزادی کی لگن سب سے پہلے میرے اندر لالہ لاجپت رائے کی ان تقریروں سے پیدا ہوئی جن میں انہوں نے اس صدی کے شروع کے اودھ کے قحط زدہ لوگوں کی حالت کو بیان کیا تھا۔ اور اُس حالت کی جڑ انگریزی حکومت کو ٹھہرایا تھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے اودھ کے قحط کو میں نے اپنی آنکھوں سے جاکر دیکھا تھا۔ لالہ جپت رائے کے ایک والنیٹر ہی کی حیثیت سے میں قحط زدوں کی مدد کے لئے گیا ہوا تھا۔ جو حالت میں نے دیکھی اسے یہاں تفصیل سے بیان کرنا ناممکن ہے۔ ایک بھوکی قحط زدہ پانچ چھ برس کی لڑکی کو میں نے ایک دن سڑک کے کنارے پڑا ہوا پایا۔ میں اُسے اٹھاکر اپنے کیمپ لے آیا۔ تین دن تک میں نے اُسے ہلکی خوراک پہنچاکر بچانے کی کوشش کی۔ وہ لڑکی میری گود میں ہی مری۔ اس کی موت کا اثر آج تک میرے دل پر ایک گہرا اثر ہے۔ ایک جگہ میں نے ایک دیہاتی ماں کو اپنے دو تین برس کے بیٹے کو ڈیڑھ سیر اناج کے بدلے میں بیچتے ہوئے دیکھا۔ اس طرح کے اور واقعات میں دہرانا نہیں چاہتا۔ ان واقعات کا تعلق ودیشی حکومت سے تھا۔ اِس کا یقینِ کامل میرے جیسے لوگوں کو لالہ جپت رائے جیسوں کی تقریروں کے علاوہ رمیش چندر دت کی کتاب (The Economic History of India in British) ، دادا بھائی نوروجی کی کتاب (Rule in India) اور ان دونوں سے بھی زیادہ ولیم ڈگبی ایم۔پی کی

کتاب (Prosperous British India) سے ہوا۔

اٹلی کو آسٹریا کے پنجے سے آزاد کرانے والے مشہور محبِ وطن اور انسان دوست جوزف میزینی اور اُنکی سوانح عمری کا بھی مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ چھ جلدوں میں جوزف میزینی کی سوانح عمری اُن دنوں (The Bible of Nationalists All The World Over) یعنی تمام دنیا کے قوم پرستوں کی انجیل کہی جاتی تھی۔ میزینی کی کتابیں پڑھ کر اور لالہ جپت رائے کی اپیل پر ہی میں نے اکیس ۲۱ سال کی عمر میں گھربار سے ہر طرح کا تعلق توڑ کر ایک قومی سنیاسی کی حیثیت سے اپنی زندگی ملک کی آزادی کی کوششوں کیلئے وقف کر دینے کا تہیّہ کیا تھا۔ آج اس چیز کو اکیاون ۵۱ سال ہو گئے۔ مجھے اُس وقت کے فیصلے پر آج تک فخر ہے۔

چھوٹے چھوٹے واقعات درجنوں نظر کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ لیکن مضمون لمبا ہوتا جا رہا ہے۔

جن اور ہستیوں نے میرے اوپر خاص اثر ڈالا اُن میں پہلا نام لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک کا ہے۔ اُن سے میں نے آزادی کی کوششوں کے لئے ڈٹ جانا اور گہری سے گہری گھٹا میں بھی مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دینا سیکھا۔ شری اروِند گھوش سے میں نے وہ پہلا عملی راستہ سیکھا جس کا سب سے اہم مظاہرہ دہلی میں ۱۹۱۲ء کا لارڈ ہارڈنگ پر بم تھا۔ عرصے تک میں اروند بابو کی سوسائٹی کا ممبر رہا۔ مجھے ابتک یقین ہے کہ اس راستے نے بھی اپنا کام کیا۔ لیکن ہم نے تھوڑے

ہی دنوں کے تجربے سے دیکھ لیا کہ وہ راستہ ہمیں ایک جگہ تک پہنچا سکتا تھا، آزادی نہیں دلا سکتا تھا۔ جہاں تک آزادی کے حاصل کرنے کا عملی سوال تھا مجھ پر سب سے زبردست اور گہرا اثر مہاتما گاندھی کا پڑا۔ جو راستے بند دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ انہوں نے میرے سامنے اور ملک کے سامنے شاہ راہوں کی طرح کھول دیئے۔ گوپال کرشن گوکھلے سے میں نے سب سے پہلے ذرائع کی پاکی کا سبق لیا۔ گاندھی جی میں تلک مہاراج کی زبردست قوت ارادی اور گوکھلے کی ذرائع کی پاکی دونوں پورے کمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔

فرقہ وارانہ اتحاد، ملک کی ملی جلی کلچر اور وحدت ادیان کے بارے میں میں نے بہت کچھ ڈاکٹر بھگوان داس سے سیکھا۔ اس کے علاوہ پچھلے چالیس برس کے مختلف ہندو مسلم دنگوں میں جو کچھ میں نے دیکھا اور خاص کر ۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کے دنوں میں اور اس کے بعد جو کچھ میں نے ہزاروں میل گھوم کر پاکستان میں اور بھارت میں دونوں جگہ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس سے یہ حقیقت میرے دل پر نقش ہو گئی کہ الگ الگ مذہبوں کے یہ الگ الگ لیبل ہرگز ہمیں ایک دوسرے سے بہتر انسان نہیں بناتے اور ملک کا حقیقی بھلا اسی میں ہے کہ ــــ بنا کسی کے ساتھ کسی طرح کی زبردستی کئے ــــ الگ الگ فرقوں اور الگ الگ مذہبوں کی یہ سب دیواریں ٹوٹ کر ہم سب اُس ایک مذہب عشق، مذہب انسانیت یا پریم دھرم پر عامل ہوں جس کی مولانا روم اور کبیر صاحب جیسے بزرگوں نے ہمیں دعوت دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بغیر ہندوستان امن عالم کے قیام میں وہ حصہ نہیں لے سکتا جو اُس کے لئے لینا بدا ہے۔

نیاز فتحپوری

اس وقت میری عمر عیسوی سنہ کے لحاظ سے ۷۲ سال کی ہے، اور ہجری سنہ کے لحاظ سے ۷۴ سال کی یا اس سے کچھ زیادہ۔ میرا تاریخی نام لیاقت علی خاں ہے جس کے اعداد ۱۳۰۲ ہوتے ہیں اور اسی ہجری سنہ میں میں پیدا ہوا۔

مجھے اپنی زندگی کی سب سے پہلی بات جو یاد ہے وہ اس وقت کی ہے جب میری عمر صرف ۴ سال کی تھی۔ اور یہ میری علالت سے متعلق تھی۔ اس کے دوسرے سال میری بسم اللہ ہوئی۔ اور اس وقت سے لے کر اس وقت تک جو کچھ مجھ پر گذرا وہ سب یاد ہے۔ اس لئے اگر میں اپنے سوانح لکھنے بیٹھوں تو

اس کے معنی یہ ہیں کہ تقریباً ۷۰ سال کی داستان آپ کے سامنے دہراؤں اور یہ فی الحال
ممکن نہیں۔ اس لئے اگر مجھ سے اپنی سوانح لکھنے کی درخواست کی جاتی تو میں اسے
یقیناً مسترد کر دیتا۔ لیکن اس وقت سوال یہ ہے کہ میری علمی و ادبی زندگی کن کن
ہستیوں سے متاثر ہوئی۔ اور اس تاثر کی نوعیت کیا تھی۔ اس طرح موضوع گفتگو
نسبتاً مختصر ہو جاتا ہے۔ اور میں اس پر لکھنے کی جراءت ایک حد تک کر سکتا ہوں۔
ایک حد تک میں نے اس لئے کہا کہ یہ داستان بھی اپنی جگہ بہت طویل ہے۔ لیکن چونکہ یہ ضروری
نہیں کہ اس سلسلہ میں میں ان تمام ہستیوں کا ذکر کروں جو میری زندگی کے بنانے یا
بگاڑنے کی ذمہ دار ہیں۔ بنابراں میں ان میں سے صرف چند کے ذکر پر اکتفا کروں
گا، جنھوں نے واقعی میری زندگی میں انقلاب پیدا کیا۔

قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر آؤں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ
میں غیر معمولی PRECOCIOUS (قبل از وقت پختہ ہو جانے والی) فطرت لے کر
آیا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ میرے ذہنی انقلاب کا ایک بڑا سبب میری یہ فطرت
بھی تھی۔ عمر کے اس حصے میں جبکہ عام طور پر بچے صرف کھیلتے کودتے ہیں، میں
تعلیم کے ان منازل سے گذر رہا تھا جو عموماً سن بلوغ میں طلبہ کے سامنے آتی ہیں یا
میں اسکی تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ سنہ ۱۸۹۳ء میں
جب میری عمر سات سال کی تھی، سکندر نامہ اور کیمیائے سعادت پڑھتا تھا
(گلستاں، بوستاں والی منزل اس سے قبل ہی گذر چکی تھی) اس کا اظہار اس
لئے کیا کہ آپ کو میری PRECOCITY کا بھی اندازہ ہو سکے۔ اور اس کے ساتھ اس
امر کا بھی کہ میری یہی فطری خصوصیت تھی جس نے آگے چل کر مجھے قدامت پرستی کا (خواہ

وہ مذہب سے متعلق ہو یا کسی اور ذہنی رجعت پسندی سے، مخالف بنا دیا۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ باوجود اس ذہنی خشونت کے میرا AESTHETIC (جمالیاتی، ذوق بھی مجھے اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا اور اچھی صورت اور اچھی آواز میری کمزوری تھی' جو ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ جس نے میری زندگی کو رنگینی بھی بخشی اور داغدار بھی کیا۔ میری راہ میں کانٹے بھی بچھائے اور پھول بھی برسائے۔ لیکن اس وقت میں اپنی زندگی کے اس پہلو کا ذکر نہیں کروں گا، گو میری ادبی زندگی کا انقلاب زیادہ تر انھیں دو کمزوریوں کا مرہون منت ہے۔

میں اپنی ابتدائی تعلیم کی تفصیل بھی بیان نہیں کروں گا، کیونکہ وہ موضوع زیر بحث سے خارج ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ میری عمر کا بارہواں سال ہے اور میں اپنے وطن (فتحپور) کے مدرسہ اسلامیہ میں تعلیم کی غرض سے آ جاتا ہوں۔ یہ مدرسہ عربی کا تھا جسے مولانا سید ظہور الاسلام صاحب نے قائم کیا تھا' جہاں صرف درس نظامی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ یہ مولانا لطف اللہ علیگڈھی کے شاگرد، اور مولانا شاہ فضل الرحمان (گنج مراد آباد) کے مرید تھے۔ ان کے ایک خواجہ تاش مولانا نور محمد صاحب بھی تھے اور انھیں کو مولانا ظہور الاسلام صاحب نے اس مدرسہ کا نگراں و مختار کل بنا دیا تھا۔

یہ پنجاب کے کسی مقام (شاید قصور) کے رہنے والے تھے اور اپنے قد و قامت، شکل و صورت اور ذہنیت کے لحاظ سے یکسر پنجابی تھے۔ اس میں شک نہیں یہ بڑے متقی انسان تھے (اگر اتقا نام صرف عبادت و ریاضت کا ہے اور اس کا قلب کی نرمی اور جذبۂ لطف و محبت سے کوئی تعلق نہیں) لیکن سراپا

ہیبت وجبروت، یکسر تقشف و عبوس!

ان کی اس خصوصیت فطرت نے مدرسہ اسلامیہ میں بالکل چنگیزی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ اور نہ صرف طلبہ بلکہ دوسرے مدرس بھی ہر وقت خوف سے کانپتے رہتے تھے۔ برخلاف ان کے، مولانا ظہور الاسلام بڑے رقیق القلب انسان تھے، اور ان کی فطرت وذہنیت یکسر رحم وکرم تھی۔ وہ فارسی کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اور ان کے اس ادبی رجحان نے ان میں زاہدانہ احتساب اور عابدانہ دار وگیر کے بجائے بہت نرمی اور عفو ودرگزر کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ مولانا نور محمد صاحب انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے، اور مولانا ظہور الاسلام صاحب موافق اور اس ذہنی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ اسلامیہ میں عرصہ تک انگریزی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ گو ابتدائی مدرسوں میں انگریزی کی تعلیم شروع ہو گئی تھی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں مولانا نور الحسن صاحب حج کو چلے گئے۔ اور ان کی اس غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مولانا ظہور الاسلام نے دفعتًا انٹرنس تک کے درجے کھول دیے۔ مولانا نور الحسن صاحب کی سخت وکرخت ذہنیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ حج سے واپس آئے اور انھوں نے یہ دیکھا کہ مدرسہ کی تو بالکل کایا پلٹ گئی ہے۔ اور بوریہ اور بوسیدہ دری کے بجائے کرسی اور بنچوں نے جگہ لے لی ہے تو ان کی برہمی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ان تمام چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کیا اور وہ اسے برداشت نہ کر سکے کہ جہاں صرف یزداں کی حکومت تھی وہاں اہرمن کا عمل ودخل پایا جائے۔ یہ وقت بڑا نازک تھا۔ اور مولانا ظہور الاسلام، مولانا نور محمد صاحب کی اس ذہنیت سے بڑے آزردہ تھے، انھوں نے نہایت

متانت وخوش اسلوبی سے یہ سب کچھ جھیلا۔ اور مدرسہ کی عربی شاخ کو علیحدہ کرکے مولانا نور محمد صاحب کو اس کا مالک و مختار بنا دیا اور انگریزی تعلیم کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے اپنی عربی تعلیم کا بڑا حصہ اس دو عملی میں بسر کیا اور میری ذہنیت پر اس کا اثر پڑا۔ میں ایک ہی وقت میں مولانا نور محمد صاحب سے عربی بھی پڑھتا تھا اور انگریزی شاخ میں انگریزی بھی، اور دو مختلف کیفیات لے کر گھر لوٹتا تھا۔

مولانا نور محمد صاحب عربی کے عالم تھے، لیکن محض صرف و نحو اور فقہ و حدیث کی حد تک۔ ان کو منطق و فلسفہ کا ذوق کم تھا اور ادبیت کا تو کوسوں پتہ نہ تھا۔ عربی و فارسی ادب تو کیا وہ اردو ادب سے بھی بالکل اجنبی تھے، وہ عالم ضرور تھے، لیکن ان کا علم حاضر نہ تھا اور جب کبھی وہ کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو ہمیشہ شروح و حواشی سے مدد لیتے تھے۔ اور کوئی بے ساختہ تقریر کسی علمی موضوع پر نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اس پر سختی کا یہ عالم تھا کہ طلبہ کو سخت جسمانی ضرر پہونچانے سے بھی ان کو دریغ نہ تھا۔ یہ میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میری ذہنیت میں مذہب و مذہبیت سے انحراف کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کی ذمہ داری ایک حد تک اس ماحول پر بھی تھی۔ میں مولانا کا بہت ادب کرتا تھا اور ادب نہ کرتا تو کیا کرتا۔ بزور مشت اس پر مجبور تھا۔ مولانا کی طرف سے محبت کبھی کسی طالب علم کے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ وہ اس رمز سے واقف ہی نہ تھے کہ

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے
بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ مولانا کی اس سخت گیری اور طبعی کرختگی کا سبب محض
ان کا مذہبی تشقف تھا اور میں اس کمسنی میں بھی بارہا سوچا کرتا تھا کہ اگر عبادت اور مذہبی
تعلیم کا صحیح نتیجہ یہی ہے تو مذہب و مذہبیت کوئی معقول بات نہیں۔ دوسری چیز
جس نے مجھے مذہبیت کی طرف سے بددل کیا، اس مدرسہ کا حافظ خانہ تھا۔ یہ بڑا
قدیم ادارہ تھا۔ جس میں طلبہ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا۔ حافظ قادر بخش جو اپنی
خشونت کے لحاظ سے مولانا نور محمد صاحب سے کم نہ تھے، اس ادارہ کے تنہا
ذمہ دار تھے۔ اور یہ جس بے دردی سے قرآن حفظ کراتے تھے اس کے خیال
سے میرے جسم کے رونگٹے اب بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ حفظ قرآن
کے باب میں میرے والد کا مسلک کچھ اور تھا۔ وہ اس کے سخت مخالف تھے
کہ بچوں کو ابتدا ہی سے کسی غیر زبان کی تعلیم میں لگایا جائے۔ وہ بغدادی قاعدہ
کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ جس میں صرف زبان کو توڑ مروڑ کے رکھ دیا گیا ہے
اور عربی کے غیر مانوس و مہمل الفاظ کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ میرے والد نے میری
قرآنی تعلیم کی طرف اس وقت توجہ کی جب اردو میں اچھی طرح لکھنے پڑھنے لگا
اور اس قدغن کے ساتھ کہ کلام مجید کا ترجمہ پڑھایا جائے۔ اس سے ایک مقصد
تو ان کا یہ تھا کہ قرآن کے پڑھنے کے بجائے اس کے سمجھنے کی طرف ذہن کو
مائل کیا جائے اور دوسرا یہ کہ جب اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ اردو میں نگاہ سے
گذر جائیگا تو اردو پڑھنے کی مشق بھی کافی ہو جائے گی۔ بہر حال خدا کا شکر
ہے کہ مجھے اس حافظ خانہ میں جو واقعی "عذاب خانہ" تھا۔ مجھے واسطہ نہیں پڑا۔
لیکن یہاں جو عذاب بچوں پر نازل ہوتا تھا۔ اس سے میں کیا، شہر کا ہر شخص

واقف تھا۔ صبح سے دوپہر حافظ خانہ کی چیخ پکار، حافظ قادر بخش کی ستم رانیاں، اور بچوں کی آہ و بکا ہر وقت کانوں میں آتی رہتی تھی۔ بچوں کے جسم بید کی ضرب سے لہولہان اور دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ان کے سروں کو زخمی کرنا اس ظالم و بے رحم حافظ کا دستور تھا۔ مجھے اس سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ کبھی کبھی میں والد سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن کا حفظ کرانا اس حد تک ضروری ہے کہ بچہ کا جسم و دماغ دونوں کو مجروح و بیکار کر دیا جائے تو قرآن سے انکار ہی بہتر ہے۔

لیکن میرا ماحول سب کا سب ایسا تھا کہ وہ ان باتوں کو محسوس ہی نہ کرتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ حفظ قرآن اتنے بڑے ثواب کا کام ہے کہ اگر اس سلسلہ میں انسان اپنے توازنِ دماغ کو بھی کھو بیٹھے تو اُسے انعام آخرت کی توقع پر برداشت کرنا چاہیئے۔ بہرحال مدرسہ اسلامیہ میں مولانا نور محمد صاحب کی سخت گیری سے اور حد سے بڑھے ہوئے تقشف اور حافظ خانہ کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا، میرے اندر مذہب کی طرف سے ایک خاص کیفیت احتراز کی پیدا کر دی تھی، اور میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی معقول مذہب نہیں۔ میں نماز کا پابند تھا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ تاہم یہ مجھے خوب یاد ہے کہ جب مولانا نور محمد صاحب نماز پڑھاتے تھے تو میرا جی بالکل نہ لگتا تھا۔ کیونکہ وہ بد آواز اور بد لہجہ شخص تھے، وہ قرآن کی آیتوں کو پڑھتے نہیں تھے، ذبح کرتے تھے، برخلاف اس کے جب کبھی مولانا ظہور الاسلام کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو ذہن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ان کے لہجہ کی نرمی و رقت اور اس کے لحن کا میرے دل پر بہت اثر پڑا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مولانا نور محمد صاحب پر کبھی قرارت کے وقت کوئی کیفیت طاری

ہوتی ہو۔ خواہ وہ ذکر قیامت کی آیتیں ہی کیوں نہ پڑھ رہے ہوں۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا ظہور الاسلام نے کوئی آیت پڑھی ہو اور ان کی آواز گریہ آلود نہ ہو گئی ہو۔ مگر مجھے زیادہ تر واسطہ انھیں حضرت سے پڑتا تھا۔ اور میری دل گرفتگی بڑھتی جاتی تھی۔

جس وقت تک میں نے مولانا سے صرف و نحو، منطق و فقہ کی تعلیم حاصل کی اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ درس نظامی کی کتابیں ان علوم و فنون پر چند مسلمہ قواعد و اصول پر لکھی گئی ہیں۔ اور ان کو پڑھنا محض پڑھ لینا یا یاد کرنا تھا۔ لیکن جب معانی و بیان اور عقاید و حدیث کی کتابیں سامنے آئیں، تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا اس میدان کے مرد نہ تھے۔ مختصر المعانی کا درس شروع ہوا اور بالکل میکانکی قسم کا کیونکہ وہ ادیب نہ تھے، عقاید و حدیث کی کتابوں میں مجھے اکثر سوال کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن اکثر سوال تو میں خوف کی وجہ سے کر نہ سکتا تھا اور اگر کبھی اسکی جرأت کی تو اس کا تشفی بخش جواب نہ پایا۔ ایک بار "شرح عقائد نسفی" کے درس میں "لایجوز اللعن علی الیزید" کا مسئلہ سامنے آیا۔ میں نے سوال کیا کہ اس مسئلہ کا تعلق عقاید سے کیا ہے۔ کیونکہ عقاید کا اطلاق صرف ان باتوں پر ہو سکتا ہے جن پر مذہب کا انحصار ہے۔ اور یزید کے بُرا یا اچھا کہنے کا اس سے کیا واسطہ ہے۔ اگر کوئی شخص یزید کو بُرا یا اچھا سمجھے تو کیا وہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔ واضح رہے کہ اس وقت میری عمر ۱۳ سال سے زیادہ نہ تھی اور میرے ساتھی طلبہ سب مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے (جن میں سے ایک مولانا حسرت موہانی کے بڑے بھائی روح الحسن تھے) لیکن ان میں سے کوئی اس کے لئے آمادہ نہ تھا کہ وہ میری ہاں میں ہاں ملائے۔ شاید اس لئے کہ وہ واقعی لعن یزید کے مسئلہ کو اسقدر اہم سمجھتے تھے یا یہ کہ مولانا کا رعب ان کو لب کشائی کی اجازت نہ دے

سکتا تھا۔ میں اس قسم کی علمی بحث کے لئے بدنام تھا اور باوجود مولانا کی خشونت و برہمی کے بھی مجھ سے رہا نہ جاتا تھا۔ اور میں مشکل ہی سے کسی ایسی بات کو تسلیم کرتا تھا جو میری سمجھ میں نہ آئے۔ میری اس گفتگو پر مولانا کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے، انھوں نے اصولاً یہ تو تسلیم کرلیا کہ لعن یزید کا مسئلہ اتنا اہم نہیں کہ اس پر کفر و اسلام کی بنیاد قائم ہو۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اسکی اہمیت پر کافی زور دیا اور اس کا سبب وہ اس کے سوا کچھ نہ بتا سکے کہ یہ مسئلہ چونکہ نفس مفہوم "معصیت" سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کا ذکر ضروری تھا۔ اس کے بعد میں نے پھر اصل مسئلہ کو لیا کہ "لعن یزید" کیوں جائز نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ ممکن ہے کہ خدا نے یزید کی غلطی یا معصیت کو معاف کردیا ہو۔ اور اس امکان کی بنا پر لعن یزید ایک ایسے شخص پر لعنت بھیجنا ہوگا جسکی برائی یا معصیت کو ہمیں کوئی یقین نہیں۔ میں نے پھر دریافت کیا کہ لعن کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس سوال پر مولانا کی خشونت بڑھ گئی۔ فرمانے لگے کہ لعن بھیجنے سے مراد ایک شخص کو برا سمجھ کر اس کے حق میں بد دعا کرنا ہے۔ میں نے کہا پھر یزید کیا معنے ہر اس شخص کی لعنت کا سوال سامنے آتا ہے جس کو ہم برا سمجھیں، یہاں تک کہ خود یزید پر لعنت بھیجنے والا بھی اس میں شامل ہے۔ کیونکہ اگر خدا یزید کو معاف کرسکتا ہے تو وہ یزید کو برا کہنے والے کو بھی معاف کرسکتا ہے۔ علاوہ اس کے میں سمجھتا ہوں کہ لعن کا تعلق در اصل ہماری ذاتی رائے اور تحقیق سے ہے اور یہ نتیجہ ہے ایک ایسے احتساب کا جو ہمیں ایک رائے قائم کرنے اور اس رائے کے اظہار کی بھی اجازت دیتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک شخص جو یزید کے کردار کو قابل مذمت قرار دیتا ہے اسے ظاہر نہ کرے خاص کر ایسی صورت میں جبکہ یہ مسئلہ ایک حیثیت سے

قومی، سیاسی، اجتماعی و ملکی اہمیت بھی رکھتا ہو۔ پھر اس وقت تو نہیں، لیکن بہت دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں جو باتیں جس انداز سے ۱۸۹۶ء میں کیا کرتا تھا وہ عام ذہنیت کے لحاظ سے بہت بعد کی اور مولویانہ ذہنیت کے لحاظ سے تو وہ بالکل ہی مہمل چیز تھی۔ میرے ساتھ درس میں اور بھی متعدد طلبہ تھے جو عمر میں سب کے سب مجھ سے بڑے تھے۔ اور بعض تو میرے والد کے عمر کے تھے۔ مثلاً عزیز الحسن غوری جو دہیں فتحپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ شاعر بھی تھے اور مجذوب تخلص کرتے تھے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ان میں بھی کوئی بھی ایسا نہ تھا جو میری ہاں میں ہاں ملاتا۔ یہ سب کے سب بڑی سخت رجعت پسندانہ و مقلدانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ اور وہ مذہبی کتابیں اس لئے نہ پڑھتے تھے کہ انہیں سمجھیں بلکہ صرف اس لئے کہ انہیں پڑھیں اور اس یقین کے ساتھ کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے وہ وحی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں اپنی جماعت میں نکو بن کر رہ گیا تھا اور مجھے دیکھتے ہی مولانا کی پیشانی پر شکنیں آجاتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ایک بڑا پر لطف واقعہ پیش آیا۔ ایک دن مولانا نے میرے والد سے شکایت کی کہ آپ کا لڑکا بڑا حجتی ہے اور کوئی بات آسانی سے اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے اور طلبہ کا بھی حرج ہوتا ہے۔ میرے والد نے ان کی تفصیل دریافت کی تو مولانا نے یہی لعن یزید والی بحث پیش کر دی میرے والد پرانے زمانے کے سخت قسم کے پٹھان تھے۔ وہی سپاہیانہ وضع و صورت اور وہی لب و لہجہ۔ مذہباً وہ حنفی تھے۔ لیکن علی و حسین کے باب میں ان کا مسلک ایک حد تک تفضیلیہ تھا، اور مذہب کا تاریخی مطالعہ ان کا بہت وسیع تھا۔

مولانا سے یہ قصہ سنتے ہی، ان کی تیوریاں چڑھ گئیں وہ بڑے صاف گو انسان تھے، یہ سنکر بولے کہ مولانا یہ بتائیے کہ لعن یزید اگر ناجائز ہے تو یزید کو برا کہنے والا کسی گناہ صغیرہ کا مرتکب ہوگا یا گناہ کبیرہ کا۔ اور اگر لعن یزید "گناہ صغیرہ" ہے تو عقاید کی کتاب میں صرف ایک اسی گناہ صغیرہ کا ذکر کیوں اس قدر اہتمام سے کیا گیا ہے اور دنیا کے دوسرے ہزاروں معاصی صغیرہ کو چھوڑ دیا گیا لیکن اگر گناہ کبیرہ ہے تو پھر دوسرے معاصی کبیرہ کی طرح اس کی کوئی حد یا سزا کیوں نہ مقرر کی گئی۔ مولانا معاف فرمائیے آپ لوگ صرف درس نظامی کے مدرس ہیں اور اسی کے معلم۔ آپ کا علم صرف چند مخصوص درسی کتابوں تک محدود ہے۔ نہ آپ لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور نہ فلسفۂ تاریخ کا، آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ تاریخ اسلام کا سب سے اہم واقعہ قتل عثمان تھا۔ اور یہ اتنا بڑا فتنہ تھا جس نے نہ صرف مسلمانوں میں تفریق پیدا کردی، بلکہ تاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ نفس اسلام و عقاید اسلامی پر بھی بڑا خراب اثر ڈالا۔ اور اسلام نام رہ گیا صرف ان سیاسی عقاید کی تبلیغ کا جو علوئین اور اموئین کے طرف سے پھیلائے جا رہے تھے۔ ایک طرف علی اور ان کی اولاد پر لعنت بھیجنا مذہب کا ضروری جزو قرار پایا اور دوسری طرف امیر معاویہ اور ان کے اخلاف کو برا کہنا مذہبی فریضہ بن گیا۔ اسلام کی سادگی ختم ہوگئی اور ملک کی سیاسی مصلحت و ضرورت اس پر غالب آگئی۔ ہر فریق کی موافقت میں حدیثیں گڑھی جانے لگیں۔ مسائل فقہ وضع ہونے لگے۔ تاریخیں مسخ کی گئیں۔ یہاں تک کہ صحیح اسلام گم ہو گیا۔ اور دنیا اسکی مسخ شدہ صورت ہی کو اصل مذہب سمجھنے لگی۔ آپ کو خبر نہیں کہ شرح عقائد نسفی، امویین کے عہد کی کتاب ہے، جو علوئین کے شدید دشمن تھے۔ اور اسی لئے

لعن یزید کے مسئلہ کو اس قدر اہتمام کے ساتھ اس میں بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ دراصل "حسین و یزید" کا معاملہ محض ایک تاریخی چیز ہے جس سے عقاید کو کوئی واسطہ نہیں اور محض ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے اس پر غور کرنا چاہئیے۔ پھر اگر کوئی شخص واقعاتی حیثیت یا یزید کے کردار کے لحاظ سے اس مسئلہ پر غور کر کے اس نتیجے پر پہونچے کہ یزید نے جو کچھ حسین کے ساتھ کیا وہ حد درجہ وحشیانہ تھا اور وہ اس کا اظہار کرے تو کیوں اُسے ناجائز قرار دیا جائے۔ لفظ لعن یا لعنت کا استعمال تو اس باب میں صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس میں مذہبی اہمیت پیدا ہو جائے۔ ورنہ یزید کو بُرا سمجھنے اور کہنے کا تعلق صرف تاریخی استنتاج سے ہے۔ اور اس سے کسی کو باز نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر میرے لڑکے نے آپ سے اس مسئلہ میں کوئی مخالفانہ گفتگو کی ہے تو اسکو اس گفتگو کا حق پہونچتا ہے۔ کیونکہ آپ کے مدرسے میں آنے سے قبل وہ تاریخ کا کافی مطالعہ کر چکا ہے۔ اور بحمد اللہ اتنی کم عمری ہی میں اُسے اتنا درک پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ایسے مسائل میں خود بھی عقل سے کام لیکر کسی نتیجہ تک پہونچے، صرف و نحو یا ادب کا درس تو خیر، مقررہ قواعد و اصول کا پابند ہے اور ریاضی کی طرح انھیں ماننا ہی ہے۔ لیکن فقہ و حدیث کے درس میں آپ اُسے مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی عقل سے کام نہ لے۔ میں اس کا قائل نہیں کہ خدا کے پاس جتنی عقل تھی وہ سب اسلاف میں تقسیم ہو چکی۔ اور اب انسان کو صرف گدھا پیدا کرتا ہے بلکہ عقل کا دروازہ اب پہلے سے کہیں زیادہ کھل گیا ہے اور مہربانی فرما کر اس دروازے کو میرے لڑکے پر بند نہ کیجئے۔ میں نے آپ کے پاس اُسے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ آپ سے وہ کچھ سمجھ حاصل کر سکے، نہ یہ کہ اس کے پاس جو تھوڑی بہت سمجھ

موجود ہے۔ وہ بھی اس سے چھین لیں۔

رہا اصل مسئلہ یزید کے لعن وطعن کا سو مولانا، آپ کی عقاید نسفی جو چاہے کہے، لیکن میں یزید کو برا کہتا ہوں اور اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں، بلکہ ان کو بھی بُرا سمجھتا ہوں جو اس کے بُرا کہنے کو بُرا سمجھتے ہیں۔

میرے والد بڑے خوش بیان اور بیباک مقرر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع بھی تھا اور حاضر بھی۔ بڑے بڑے مولوی مذہبی مباحث میں ان کے سامنے سپر ڈال دیتے تھے۔ ہمارے مولانا تو خیر صرف مدرس ہی تھے وہ کیا جواب دے سکتے تھے۔

یہ واقعہ میری زندگی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ کیونکہ اس سے مجھ میں مذہبی تحقیق کا ایک نیا رجحان پیدا ہوگیا اور صحیح اسلام کو سمجھنے کا شوق میرے اندر بہت بڑھ گیا۔

میں مدرسہ اسلامیہ میں عربی کا درس نظامی حاصل کر رہا تھا اور گھر پر والد سے فارسی پڑھتا تھا۔ چنانچہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے فارسی میں رسائل طغرا بھی پڑھ رہا تھا (جس میں مولانا حسرت موہانی بھی میرے ہم سبق تھے) اور عربی میں درس نظامی کا بڑا حصہ ختم کرکے اس حد تک پہونچ گیا تھا جب صرف و نحو اور منطق کی ضروری تعلیم کے بعد فقہ میں کنز الدقایق، شرح ہدایت کی، عقاید میں شرح نسفی کی، بیان و بلاغت میں مختصر المعانی کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔

گھر پر میرے اوقات فرصت میں دو خاص مشغلے تھے، ایک فارسی دواوین کا مطالعہ جن میں بیدل اور غالب سے مجھے خاص شغف تھا، میرے والد فارسی کے

بڑے مشہور شاعر و انشا پرداز تھے۔ غزل سے انھیں بہت کم دلچسپی تھی، صرف قصاید لکھتے تھے اور وہ بھی نعت و منقبت میں۔ صہبائی کے شاگرد تھے اور غالب کی فارسیت کے شیدائی، اس وقت فارسی تعلیم کا رواج کافی تھا۔ اور صبح کو میرا مکان ایک اچھا خاصا درسگاہ ہو جاتا تھا۔ جہاں زیادہ تر پختہ عمر کے لوگ میرے والد سے فارسی پڑھنے آجاتے تھے۔ وہ فارسی کی ابتدائی کتابیں نہیں پڑھاتے تھے۔ بلکہ ان کی تعلیم شروع ہوتی تھی مینا بازار۔ پنج رقعہ۔ رسائل طغرا۔ شبنم شاداب بیدل۔ سکندر نامہ۔ شاہنامہ اور دفاتر ابوالفضل سے۔ گلستاں۔ بوستاں اور رقعات عالمگیری وغیرہ ابتدائی کتابوں کا درس میرے سپرد کر دیتے تھے۔ میرا دوسرا شغلہ غیر مذہبی کتابوں کا مطالعہ تھا۔ جن میں تصوف کی بعض کتابوں سے مجھے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں ابن عربی کی فصوص الحکم کا ترجمہ میں نے شروع کر دیا۔ اور جب مولانا نور محمد صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ نہایت سخت وہابی قسم کے مسلمان تھے۔ اور ابن عربی کے فلسفۂ تصوف کو جو مادرار مذہب کچھ اور چیز ہے، وہ کبھی پسند نہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں مجھے شعر کہنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا فارسی میں کبھی کبھی اور اردو میں اکثر۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا حسرت موہانی فتحپور ہی میں زیر تعلیم تھے اور ایک خاص حلقہ میں ان کی غزلوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ میں بھی ان کے رنگ تغزل سے کافی متاثر تھا۔ لیکن شعر کہتا تھا غالب کے دقیق رنگ میں جس میں فارسیت زیادہ ہوتی تھی۔ جذبات بالکل نہ ہوتے تھے اور نہ ہونا چاہئے تھے۔ میری عمر ہی کیا تھی۔ حسن و عشق کی باتوں کا صرف کتابی علم تھا اور ان کے

اظہار پر بھی سلیقہ نہ تھا۔ بعد کو میری شاعری کا یہ رنگ بدلا، یہاں تک کہ تیر دل و دماغ پر چھا گیا۔ اس رنگ میں کہہ تو نہ سکتا تھا، لیکن میر ہی پر دُھنتا تھا۔ چونکہ حسرت سے روز ملنا ہوتا تھا، ان کی شاعری سے بھی کافی متاثر تھا اور غالباً اس لئے کہ ان کی فارسی ترکیبیں مجھے پسند تھیں اور پسند کا یہ حال تھا کہ جب تک کسی شعر میں کچھ فارسیت نہ پائی جائے، مجھے تسکین نہ ہوتی تھی۔ یہ نتیجہ تھا ابتدائی کلاسیکل فارسی تعلیم کا، اور اس فارسی ماحول کا جس میں میری تربیت ہوئی۔ میرے والد ہمیشہ اہل علم کو فارسی ہی میں خط لکھتے تھے۔ اور طبقۂ علمار میں صرف مولانا محمد علی بہاری (جو کانپور میں مستقلاً قیام پذیر تھے اور ناظم دارالعلوم ندوہ تھے) ایک ایسے مولوی تھے جو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور خود بھی میرے والد سے فارسی ہی میں مراسلت کرتے تھے۔ اس مراسلت کی ترتیب و تدوین میرے ہی سپرد تھی۔

اس بیان سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ فارسی ادب کا ذوق مجھ میں بہت کم سنی سے پیدا ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ اردو ادب کا بھی، لیکن اسکی ابتدا نثر سے نہیں بلکہ شاعری سے ہوئی۔ اور جب میں مدرسہ اسلامیہ میں درس نظامی کے لئے بھیجا گیا تو میرا شعور کافی پختہ ہو چکا تھا اور اسی لئے میں اپنے اساتذہ سے بعض دینی مسائل میں جنکو میرا ذہن قبول نہ کرتا تھا حجت کر بیٹھتا تھا۔

شکر ہے کہ حدیث کا درس ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ لیکن جب اس کا درس شروع ہوا تو ایک بڑا ہنگامہ اپنے ساتھ لایا۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ اتفاق سے اسی زمانے میں مولانا نور محمد صاحب حج کو تشریف لے گئے اور ان کی جگہ مولانا محمد حسین خاں مقرر کئے گئے۔ یہ دیوبند کے فارغ التحصیل عالم تھے۔ نازک

نقشے کے نہایت گورے چٹے پستہ قد مخنی انسان حد درجہ مغلوب الغضب اور خشک عبوس۔ ان کو دیکھتے ہی مجھے آتش کا یہ مصرع یاد آگیا۔

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے

انھوں نے آتے ہی سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا کیونکہ دیوبند والے علوم دینیہ میں حدیث ہی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اسی میں وہ زیادہ درک رکھنے کے مدعی ہیں۔ میں نے اس وقت تک حدیث کی کوئی کتاب شروع نہ کی تھی۔ اس لئے جب مشکوٰۃ کا درس شروع ہوا تو میری آنکھوں سے پردہ سا اٹھ گیا۔ میں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ اسلام میں لحامات و خرافیات کا عنصر کہاں سے آیا۔

میں نے پہلے ہی دن یہ سمجھ لیا تھا کہ ان نئے مولانا سے میری نہیں بن سکتی۔ مولانا نور محمد صاحب تو خیر کسی وقت مسکرا بھی پڑتے تھے، لیکن ان حضرت کی سرکر پیشانی اس وقت بھی دور نہ ہوتی تھی جب وہ خدا کے سامنے نماز میں مصروف ہوتے تھے۔ اور درس و تدریس کے وقت تو وہ بالکل خدائے قہار نظر آتے تھے۔

تقرر کے بعد ایک ہفتہ تک تو ان کی تعلیم کا معمول وہی رہا جو اس سے قبل پایا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے اپنے اوقات اور کتابوں میں کچھ ردّ و بدل کیا۔ فقہ تو نہیں لیکن منطق، فلسفہ، معانی و ادب کی کتابوں کا درس کم کر دیا اور درس حدیث کی ابتدا کی جو اس وقت تک نہ ہوئی تھی۔ آخرکار ایک دن اعلان کر دیا کہ کل سے مشکوٰۃ شریف کا درس شروع ہوگا وہ ہوگیا۔

اس سے قبل فقہی کتابوں کے درس کے سلسلہ میں احادیث کے حوالے تو بارہا نگاہ سے گذر چکے تھے، لیکن فن کی حیثیت سے کتب احادیث کے مطالعہ کا اس سے قبل کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔ میرا معمول تھا کہ ہر کتاب کے درس سے پہلے خود گھر میں اس کا غائر مطالعہ کرتا تھا۔ اور جو جو شبہات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے، یا جن حصوں کو میں سمجھ نہ سکتا تھا ان کو کاغذ پر نوٹ کر لیتا تھا۔ اور دوسرے دن درس کے وقت میں معلم و مدرس کے سامنے اپنی الجھنیں پیش کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ جس دن مشکوٰۃ کا درس ہونے والا تھا اس سے قبل کی رات میں اس ضخیم کتاب کو میں نے اپنے سامنے رکھا اور غور کرنے لگا کہ اگر ہر حدیث سے راویوں کے سلسلہ کو اڑا دیا جائے اور صرف "قال رسول اللہ" سے ابتدا کی جائے تو کتاب بھی مختصر ہو سکتی ہے اور یہ "عن فلاں، عن فلاں" کے پڑھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بھی بچ جائے۔ میں نے دوسرے دن صبح اپنے ساتھیوں سے ذکر کیا کہ آج مولانا سے ذرا یہ بات تو دریافت کرو۔ لیکن کوئی میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر کار جب درس کا وقت آیا تو میں نے مولانا سے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ "حدیث کے تقدس کا پورا احترام رکھتے ہوئے، مجھے ایک بات دریافت کرنا ہے، اگر اجازت ہو تو عرض کروں"۔ نہایت خشونت کے ساتھ بولے کیا کہنا چاہتے ہو کہو"۔ میں نے کہا "کتب احادیث میں جتنی حدیثیں ہیں ان کی تسلیم اس مفروضہ پر منحصر ہے کہ وہ سب صحیح ہیں ــــ"۔ مولانا فوراً بھپر گئے۔ اور نہایت تیز و بلند آواز سے فرمایا ــــــــ "مفروضہ! مفروضہ کیسا؟ جو حدیثیں کتاب میں درج ہیں وہ سب صحیح ہیں، اس میں فرض کرنے کا کیا سوال"۔ میں نے کہا "معافی

چاہتا ہوں، مفروضہ کہنے سے میرا مطلب بھی یہی تھا کہ جب یہ تمام احادیث صحیح ہیں تو پھر راویوں کے نام کیوں ان میں درج ہیں۔ کہیں کہیں اصل حدیث تو صرف چند الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن راویوں کی فہرست کئی کئی سطر تک چلی جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وقت اور کاغذ دونوں کی کافی بچت ہو سکتی ہے۔" اس کے جواب میں انھوں نے دانت پیس کر کہا کہ "احمق، راویوں کے نام اس لئے ظاہر کئے جاتے ہیں کہ ان پر حدیث کی صحت کا انحصار ہے۔ اگر راوی ثقہ و معتبر نہیں ہیں تو حدیث کو بھی معتبر نہ سمجھا جائے گا۔"

میں نے عرض کیا "یہ بالکل درست ہے اور یقیناً جامعین حدیث نے راویوں کی چھان بین کرنے کے بعد ہی صحیح احادیث کو یکجا کیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کو اس فہرست رواۃ سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ جبکہ ہم کو خود ان راویوں کا حال معلوم نہیں۔"

مولانا نے فرمایا "راویوں کا حال معلوم کرنے کی ہم کو ضرورت بھی کیا ہے۔ جبکہ حدثیوں کی کتابوں میں صرف وہی احادیث درج ہیں جن کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں۔"

میں نے کہا "اس صورت میں "علم الرجال" ہمارے لئے بالکل بیکار ہے کیونکہ ہم کو خود اپنی رائے قائم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔"

مولانا اس بحث کو زیادہ برداشت نہ کر سکے اور انتہائی غیظ کے عالم میں کتاب بند کر کے مجھے حکم دیا کہ "درجے سے نکل جاؤ" اسی کے ساتھ ساتھ اپنا ڈنڈا بھی اٹھایا۔ اور اگر میں فوراً اٹھ کر چلا نہ جاتا تو وہ یقیناً میرا سر زخمی کر دیتے

اس کے بعد میں کئی دن تک مدرسہ نہیں گیا۔ لیکن ایک دن پھر میرے والد پہونچا گئے۔ اور میں درس مشکوۃ میں شریک ہوگیا۔ چونکہ میں سمجھ چکا تھا کہ مولانا محض لکیر کے فقیر ہیں اور ان کا مذہبی تقشف کسی طرح عقلی محبت کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لئے طوعاً وکرہاً میں اس درس میں شریک تو رہا لیکن کوئی سوال ان سے نہیں کیا۔ اس حال میں کئی دن گذر گئے اور کوئی صورت ہنگامہ کی پیدا نہیں ہوئی۔

ایک دن دوران درس میں ایک حدیث آئی جس میں رسول اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ دنیا میں سردی وگرمی کیوں ہوتی ہے اور اس کا جواب رسول اللہ نے یہ دیا کہ "آسمان میں ایک اژدہا ہے جب وہ اپنی سانس دنیا کی طرف چھوڑتا ہے تو گرمی ہوجاتی ہے اور جب وہ سانس کھینچتا ہے تو سردی ہوجاتی ہے۔"

حدیث پڑھتے ہی باوجود انتہائی ضبط کے بے اختیار میرے منھ سے نکل گیا کہ "غلط" یہ سنتے ہی مولانا کا یہ حال ہوا جیسے کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو، اور بولے کہ "بدتمیز، تو رسول اللہ کو غلط کہتا ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ "میں رسول اللہ کو غلط نہیں کہتا۔ بلکہ اس حدیث کو غلط کہتا ہوں۔ کیونکہ رسول اللہ کبھی ایسی خلاف عقل وحقیقت بات نہیں کہہ سکتے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور میں اٹھ کر بھاگا۔ مولانا نے کچھ دور میرا تعاقب بھی کیا، لیکن میں ہاتھ نہ آیا۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے میرا پیچھا ان سے چھوٹ گیا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں میرے والد بسلسلۂ رخصت لکھنؤ جارہے تھے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے۔

فتحپور سے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد بھی میرے مذہبی ماحول میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اور کافی عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اسکی تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میرا تجربہ مولویوں کے باب میں تلخ سے تلخ تر ہوتا گیا۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ اس طبقہ کی طرف میں کبھی مائل نہیں ہوسکتا ان کی رعونت، ان کا تقشف، ان کا فرعونی انداز گفتگو، ان کا یہ عقیدہ کہ مذہب کو عقل سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اور ان کا یہ پندار کہ وہ عام سطح سے بہت بلند ہیں۔ اور ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ انھیں دیکھتے ہی سربسجود ہوجائے' مجھے ان سے متنفر کرتا جارہا تھا اور میں باربار یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ اگر یہ واقعی محض مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہے تو مذہب سے زیادہ نامعقول چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتی۔ اور اس سلسلہ میں مجھے مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا شوق پیدا ہوا میں نے مذاہب کا مطالعہ صرف اس نقطۂ نگاہ سے شروع کیا کہ اخلاق کی عملی تعلیم کے لحاظ سے کس کا کیا درجہ ہے۔ اور اس نے مجھے مولویوں سے اور زیادہ متنفر کردیا۔ کیونکہ جس حد تک تعلیم و اخلاق کا تعلق ہے، میں نے ان میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جسے بعید ترین تاویل کے بعد بھی میں اسلام اور بانیٔ اسلام کی بلند تعلیم اخلاق سے منسوب کیا جاسکتا۔ میں جس وقت ان کے بطون کا تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے بالکل سیاہ پتھر کی طرح نظر آتا ہے۔ جس میں اگر کوئی چنگاری تھی بھی تو وہ لطف و محبت کی نہ تھی بلکہ خشونت و رعونت کی تھی۔ ذات

ونفس پروری کی تھی۔ اور میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ اسکی روح بالکل اجاگر ہے اور اس کا دل بالکل ویران۔ وہ قدرت اور مظاہر قدرت سے صرف اس حد تک دلچسپی لے سکتا ہے جس حد تک اسکی حرص و آز پوری ہو سکتی ہے۔ اور خالص روحانی لطف اور جمالیاتی تسکین ذوق کے لحاظ سے اسکی ہستی بالکل "وادی غیر ذی زرع" کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہاں اس سلسلہ میں مجھے بعض ایسے مولویوں سے بھی واسطہ پڑا جن سے مجھے نفرت کی جگہ الفت پیدا ہوئی۔ لیکن یہ وہی تھے جو مولوی کم اور صوفی زیادہ تھے۔ ان میں رامپور کے مولانا وزیر محمد خاں کو میں نے سب سے بلند پایا۔ یہ بڑے فلسفی و منطقی تھے۔ اور مولانا عبدالحق خیرآبادی کے ارشد تلامذہ میں سے، لیکن درس و تدریس کی دنیا سے ہٹ کر وہ بڑے پیارے عادات و خصائل کے انسان تھے۔ ان کا علم بڑا حاضر تھا، وہ نہایت اچھے مقرر تھے اور وہ طلبہ کو ہر مسئلہ میں مطمئن کر دینے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ لیکن ان کے شاگردوں میں صرف میں ہی ایک ایسا تھا جو اخیر وقت تک ان سے محبت کرتا رہتا تھا۔ اور ایسے مسائل میں جن کا تعلق عقل یا سائنس سے ہے وہ مشکل ہی سے مجھے مطمئن کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہدیۂ سعیدیہ کے درس میں جب "ابطال حرکت زمین" کا مسئلہ سامنے آیا، تو بحث زیادہ ناگوار حد تک پہونچ گئی۔ لیکن یہ ناگواری صرف درس کی حد تک محدود رہی۔ اس کے بعد وہ پھر سراپا لطف و محبت تھے اور میں یکسر انقیاد و اطاعت۔ میں نے علماء میں ان سے زیادہ محبوب انسان کوئی نہیں دیکھا اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ بڑے صوفی

نش انسان تھے، اور سماع کے وقت ان پر جو کیفیات طاری ہوتی تھیں وہ بڑی دلچسپ، موثر اور پرخلوص ہوتی تھیں۔

اس سلسلہ میں زیادہ تفصیل سے احتراز کرتا ہوں کیونکہ یہ بڑی طویل داستان ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا میں اس جماعت اور اس جماعت کے بتائے ہوئے اسلام سے متنفر ہوتا گیا۔ اور میرا یہ جذبہ نگار کے اجرا کے بعد اس حد تک شدید ہوگیا کہ آخرکار میں نے اس جماعت کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا اور ان کے عقاید اور ان کے اخلاق پر نکتہ چینی شروع کر دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک کے مولوی میرے دشمن ہو گئے۔ اور مختلف مقامات سے میرے خلاف توہین مذہب کے مقدمات دائر کرنے کی تدبیریں شروع ہو گئیں۔ تقسیم ہند کے بعد جب مولویوں کا زور کم ہوا تو میرے خلاف ہنگامہ دار و گیر کی نوعیت بدل گئی۔ لیکن یہ فضا اب تک قائم ہے کہ مجھ ملحد و کافر کا ذکر جب کبھی ان کی محفل میں آجاتا ہے تو ان کی پیشانیوں پر اب بھی بل پڑ جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی۔ لیکن یہ اثر بالکل منفی قسم کا تھا۔ یعنی میں اُن سے متاثر تو ہوا لیکن یہ تاثر ایک نوع کا انکاری تاثر تھا۔ اور اس لحاظ سے میں ان کا شکرگذار ہوں کہ اگر ان سے مجھے واسطہ نہ پڑتا تو نہ میں اپنے مذہبی مطالعہ میں وسعت پیدا کرسکتا تھا اور نہ مسائل مذہب میں صرفِ عقلی کا سلیقہ مجھ میں پیدا ہوتا۔

اب میں اپنی زندگی کے اس پہلو کو لیتا ہوں جس کا تعلق شعر و ادب سے

UQAAB 03055798538

ہے اور اس کے بھی دو حصے ہیں، ایک کا تعلق ادیبوں اور شاعروں سے ہے اور دوسرے کا عورت اور محض عورت سے۔

شعر وسخن سے دلچسپی اور عورت کی طرف میرا انجذاب، ان دونوں کی ابتدا اگر ایک ساتھ نہیں ہوئی، تو بھی ان دونوں میں اتنا کم فصل ہے کہ میں اسکی حد بندی مشکل سے ہی کر سکتا ہوں۔

شعر وسخن کا ذوق بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں مجھ میں پیدا ہو گیا تھا اور میں فتحپور کے مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں بھی سنایا کرتا تھا۔ ہر چند ان غزلوں میں عورت یا محبوب کا ذکر محض روایتی حیثیت رکھتا تھا اور میں اس جنسی جذبہ سے آشنا نہ تھا جو شعر کے اندر خدا جانے کیا کیا صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہی جب میں لکھنؤ پہونچا تو دفعتہ یہ جذبہ بھی میرے اندر نشو ونما پانے لگا اور جب میرے شباب کا پہلا چاند یہاں طلوع ہوا تو عورت ہی میرے آغوش تصور میں تھی۔

دفعتاً فضائے مذہب و مولویت سے ہٹ کر عشق و محبت یا بالفاظ دیگر جنسی رجحان و ہیجان کی دنیا میں آجانا میری زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے گذر جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ذہنی حیثیت سے میں بڑی PRE - cocious کیفیت لیکر پیدا ہوا ہوں۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ اعصابی حیثیت سے بھی میں کچھ ایسا ہی تھا، جس کا علم مجھے فتحپور میں تو نہ ہو سکا، لیکن لکھنؤ آنے کے بعد اس نے پے در پے شہاب ثاقب کی صورت اختیار کر لی جس کا

ذمہ دار میں بڑی حد تک اپنے والد کو بھی سمجھتا ہوں۔

میرے والد عجیب و غریب اصول کے انسان تھے۔ اور بچوں کی تربیت کے باب میں وہ اس قدر وسیع الخیال تھے کہ موجودہ عہد ترقی میں بھی اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اپنے والد کا عہد شباب نہیں دیکھا، لیکن جو کچھ میں نے سنا تھا اس سے مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ انھوں نے اپنی جوانی بالکل اسی فضا میں گذاری تھی جس کا اصطلاحی نام بعد کو "شام اودھ" قرار پایا۔ اور اپنے ذوقِ شباب کی تسکین میں انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک رنگین مزاج، دولت مند انسان لکھنؤ کی نشہ بخش اور عشق خیز سرزمین میں کر سکتا تھا۔

پھر یہ بھی بالکل اتفاقی بات ہے کہ جب اپنے شیب میں انھیں پھر لکھنؤ آنے کا موقع ملا تو عہد شباب کی وہ جھُرجھُری جو عورت کے جسم سے مس ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے، سب سے پہلے یہیں میرے جسم میں بھی پیدا ہوئی۔

یہ زمانہ ہر حیثیت سے لکھنؤ کا عہد زوال تھا۔ جان عالم کے بعد کا وہ زمانہ بھی جسے "کزیں خاک مردمی خیزد" کہہ سکتے تھے، گزر گیا تھا، لیکن

ابھی باقی تھی کچھ کچھ دھوپ دیوار گلستاں پر

اور یہاں کی گلیوں میں اب بھی خاک چھاننے کو جی چاہتا تھا۔

میرے والد محکمۂ پولس سے وابستہ تھے۔ پہلے حسن گنج تھانہ کے انچارج تھے، اور پھر کوتوالی کے تھانہ میں آ گئے جو چوک کے سرے پر واقع تھا لکھنؤ کا وہی چوک جس کا ذکر رجب علی بیگ سرور نے کیا تھا اور پھر اس کے

بعد سرشار نے، میں اب بھی پڑھ رہا تھا۔ فرنگی محل میں مولانا شاہ عبد النعیم صاحب اپنی زندگی کی آخری سانسوں سے گذر رہے تھے اور فرنگی محل کے پل پر مولانا عین القضاۃ کا بالاخانہ طلبۂ حدیث کا مرکز تھا جس میں میں بھی شریک ہوتا تھا، لیکن نہایت خاموشی کے ساتھ۔ اس لئے نہیں کہ میں حدیثوں پر ایمان لے آیا تھا یا بالکل سچ سمجھ کر ان کا مطالعہ کرتا تھا بلکہ محض اس لئے کہ میں جانتا تھا، شام کو جائے احرام کے یہ سب حقے مجھے کہاں دھونا ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کے تصور میں قرآن و حدیث کیا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، تربیت اخلاق کے باب میں میرے والد کا نظریہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ وہ جنسی داعیات کو دبانے کے قایل نہ تھے۔ بلکہ ان کی تسکین ہی کو ذہنی و جسمانی نشو و نما کا صحیح ذریعہ قرار دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اکثر نوجوانوں کی صحت محض اس لئے خراب ہو جاتی ہے کہ ان کی جوانی کے اقتضاء کو روکا جاتا ہے اور اس کا اثر ان کی ذہنیت پر بھی خراب پڑتا ہے۔ اس لئے جب میں اپنی عمر کے ان حدود میں آگیا جہاں ان کو اپنے نظریے کا عملی تجربہ کرنا تھا، تو انھوں نے مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن آپ کے لئے اس امر کا تصور غالباً مشکل ہوگا کہ اب سے ۶۰ سال قبل لکھنؤ کیا چیز تھا اور اس میں کسی نوجوان کا آزاد چھوڑ دیا جانا کیا معنی رکھ سکتا تھا۔

لکھنؤ کا وہ حصہ جسے صحیح معنی میں لکھنؤ کہتے ہیں بڑا رومان آفریں حصہ تھا اور ان تمام رومانی تجربات کا مرکز چوک تھا، جہاں شام ہوتے ہی رنگینی، تعطر اور حسن و غنا کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا جس میں جینے سے زیادہ مرجانے کو جی

چاہتا تھا۔

پھر اس دورِ آزادی میں میں نے وہاں کیا کیا دیکھا، کن کن گلیوں کی خاک چھانی، کن کن دیواروں کے سائے میں اور کن کن راہ گزاروں کی خاک پر میں نے اپنے لمحاتِ شباب صرف کئے یہ بڑی طویل داستان ہے، لیکن میرے اس عہدِ آشفتہ سری کا وہ حصہ جو میری جولانگاہِ شباب کو ایک خاص حد تک کھینچ لایا اس کا اجمالی ذکر ضروری ہے۔

اس وقت لکھنؤ کی بلند معاشرت کا ضروری جزو یہ بھی تھا کہ امرازادے محافلِ رقص و غنا میں آزادی سے شریک ہوں اور بعض مخصوص ڈیرہ دار طوائفوں کی صحبت میں لکھنوی علمِ مجلس حاصل کریں۔ ان گھرانوں میں اس وقت چودھرائن کا گھرانا خاص امتیاز رکھتا تھا۔ چودھرائن کا مکان اسی جگہ تھا جہاں اب "حبابلڈنگ" ہے اور یہ مکان تہذیب و شائستگی کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

شام کو چودھرائن کا مکان بالکل دربار نظر آتا تھا جس میں شہر کے اکثر خوش ذوق لوگ شریک ہوتے تھے۔ اور اس محفل میں چودھرائن کی حیثیت ایک معلم کی سی ہوتی تھی۔ جبکی گفتگو اور اندازِ نشست و برخاست سے لوگ صحیح لکھنوی تہذیب کا درس حاصل کرتے تھے۔ اس محفل میں شعر خوانی، داستان گوئی، لطائف و ظرائف، ضلع جگت، رقص و سرود سب ہی کچھ ہوتا تھا اور جب لوگ یہاں سے لوٹتے تھے تو موسیقی کا صحیح ذوق، زبان کا صحیح استعمال، گفتگو کا خاص انداز، لب و لہجہ کی شیرینی، نشست و برخاست کا انداز اور خدا جانے کن کن باتوں کا درس لیکر لوٹتے تھے، اور اس طرح عہدِ زوال میں بھی لکھنؤ کی

تہذیب و شائستگی اس گھرانے سے بڑی حد تک قائم تھی۔ پھر اس سلسلہ میں یہاں عشق و محبت کی بھی بہت سی داستانیں بنتی رہتی تھیں۔

میرے والد نے بھی مجھے اس دربار میں بھیجنا شروع کیا اور یہیں سے میرے شباب کا وہ دور شروع ہوا جسے میں اپنے ادبی دور کا بھی آغاز کہہ سکتا ہوں'

چودھرائن کے گھر جا کر میں کیا محسوس کرتا تھا، یہاں کے ہنگامہ حسن و شباب میں مجھ پر کیا گذر جاتی تھی، میرے جسم کی رگیں وہاں کس طرح ٹوٹتی اور جڑتی رہتی تھیں، میرے شب و روز کس طرح بسر ہوتے تھے، میرے جذبات کے ہیجان کا کیا عالم تھا اور کس کس طرح مجھے صبر و ضبط کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کا بیان بڑی تفصیل کا محتاج ہے۔ اس عہد وارفتگی کا میری ادبی زندگی پر جتنا گہرا اثر پڑا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اوّل اوّل جب میں غزل کہتا تھا تو اس میں لایعنی تکلفات کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب میرا رنگ تغزل کچھ اور تھا چنانچہ جب میں اس دیار محبوب سے جدا ہونے لگا تو میں نے اپنے اس عہد رومان کی یاد میں ایک غزل لکھی۔ جس کا ایک شعر دور عروج سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا اس دور ناکامی سے جسے ہم " زہر عشق " والی فضا کہہ سکتے ہیں۔

آپ تھیں، میں تھا، شب ماہ تھی، تنہائی تھی
ہائے وہ وقت کہ دشوار تھا جینا مجھکو

اُف ری مجبوریٔ الفت، یہ خبر کسکو تھی
تمکو چاہوں گا تو جینا بھی پڑے گا مجھکو

میرا لکھنؤ چھوڑنا، ٹھیک اس وقت جبکہ میں شباب کے جرعۂ اولین سے بھی خاطر خواہ آسودہ نہ ہو سکا تھا اور یہاں کی فضائے حسن و عشق میرا دامن چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ تھی۔ میری زندگی کا پہلا سانحہ تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا کیونکہ جو زخم میں نے کھائے تھے وہ مندمل ہونے پر بھی عرصے تک رستے رہے اور اپنی آیندہ زندگی میں جب کبھی ان زخموں کے چھیڑنے کی فرصت مجھے ملی، میں نے ہمیشہ اس سے فایدہ اٹھایا ذہنی و عملی دونوں حیثیتوں سے۔ گویا یوں سمجھیے کہ فکرِ فضول بھی جاری رہی اور اسی کے ساتھ جرارت رندانہ بھی۔ گو اب اس میں صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے اور دوسری کا صرف ماتم گسار ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلۂ بیان میں، میں اصل موضوع سے ہٹتا جا رہا ہوں، لیکن مجبوری یہ ہے کہ میرے ذہنی انقلاب اور ادبی رجحانات کا تعلق زیادہ تر "مولوی" اور "عورت" ہی سے ہے۔ اس لئے مولوی کے ذکر کی تلخی کے بعد "عورت" کا ذکر آ گیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ سب کچھ کہہ جاؤں جس کے اظہار کا موقع شاید مجھے پھر نہ مل سکے۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ اس کا تعلق در اصل میرے سوانح حیات سے ہے۔ جن کی تفصیل کا موقع نہیں، لیکن چند خاص واقعات جنھوں نے واقعی میری ادبی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا اس وقت یاد آ گئے ہیں اور ان کا سرسری ذکر بغیر کسی تاریخی تسلسل کے غالباً ناموزوں نہ ہوگا۔

اپنی آوارہ گردی کے زمانے میں ایک بار میں پٹنا اور جہے گڈھ گیا اور یہاں ایک سال رہنا پڑا، یہ سال میری زندگی کا عجیب و غریب سال تھا۔ اس کا اندازہ آپ

ایک خط سے کر سکتے ہیں جو میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھا تھا:۔

"حزیںؔ کو بنارس میں ہر "برہمن بچہ" لچھمن و رام نظر آتا تھا، یہاں قدم قدم پر سیتا و رادھا کا سامنا ہے اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ

بے پردگی دیوانۂ طرحِ نقاب افگندنش

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی۔ آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بندی، اب آپ سے کیا کہوں کہ کیا چیز ہیں۔"

یہ تھا ایک عمومی تاثر یہاں کی فضا کا جس سے متاثر ہو کر میں نے چند نظمیں بھی لکھیں اور "جذبات بھاشہ" مرتب کی۔ لیکن ایک خاص واقعہ کی وجہ سے جسے یہاں کی نشہ بخش زندگی کا انتہائی عروج (climax) کہنا چاہیئے، مجھے اس سرزمین حسن و شباب کو بھی چھوڑنا پڑا، اسکی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

"شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی ہے، محل کے پائیں باغ میں روشوں پر ٹہل رہا ہوں۔ مہاراج (سر رنجور سنگھ) کی طلبی کا انتظار ہے کہ دفعتہً سامنے سے ایک مجسمۂ شباب و رعنائی نظر آتا ہے۔ ذی حیات، متحرک، نگراں، خنداں ـــ ٹھیک اسی وقت چوبدار آتا ہے اور میں چلا جاتا ہوں، لیکن دو چیزیں دماغ سے محو نہیں ہوئیں، ایک

سانولے رنگ میں شفق کا انعکاس اور طاؤس کی سی مستی رفتار،
یہ نقش بعد کو ابھرتا رہا، نشہ جنون میں تبدیل ہوتا رہا اور پھر
نامہ و پیام کی صورت اس نے اختیار کر لی۔

اس کے چند دن بعد:۔

بسنت کی صبح ہے، دربار میں رسم گلباری کا اہتمام ہو رہا ہے
گلاب اور گیندے کے سرخ و زرد پھولوں سے آنچل
معمور ہیں۔ آخر کار رسم گلباری شروع ہو جاتی ہے۔"

یہ آخری ضرب تھی جس سے میں کیا کوئی جانبر نہ ہو سکتا تھا۔ کچھ دن بعد
میں نے جب ایک عزیز دوست کو یہ سارا حال لکھا تو اس کے چند فقرے یہ بھی
تھے:۔

"تم کبھی ملو گے تو دکھاؤں گا کہ اس پھول کی پنکھڑی اب
تک میرے پاس محفوظ ہے۔ جو میرے سینے تک پہونچ
کر ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گئی ہے۔

کتانِ خویش می شویم بہ مہتاب

رہا انجام و نتیجہ، سو اس کے متعلق کیا لکھوں، غالب نے
ایک جگہ بنارس کا حال لکھتے ہوئے وہاں کی "قیامت قامتاں"
اور "مژگاں درازاں" کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"زنگیں جلوہ ہا غارتگر ہوش، بہار بستر و نوروز آغوش، سو
اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم رشک و حسد سے مر جاؤ گے تو میں

اس شعر کا صرف دوسرا مصرع لکھ کر خط کو ختم کر دیتا۔"

میرے عشق و جنون کا یہ دور مختلف مقامات سے تعلق رکھتا ہے جن میں لکھنؤ، الہ آباد، مسوری، سری نگر، ہانسی، بھوپال، رامپور اور کلکتہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

ان تمام مقامات میں میں اور میرا ذوقِ ادب عورت سے کس کس طرح متاثر ہوا اور اس میں کیا تدریجی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، بڑی طویل داستان ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص میرے افسانوں کے مجموعوں کا مطالعہ کرے تو اسکو کچھ اندازہ اس حقیقت کا ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس سے زیادہ لکھنے کا موقع یوں بھی نہیں کہ اس کا تعلق میرے سوانح سے ہے اور وہ اس وقت زیرِ بحث نہیں۔

ابتداء عمر و عنفوان شباب میں مجھے ادبی رسایل کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اور ان سب میں مجھے مخزن سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید سجاد حیدر یلدرم ترکی "انشاء عالیہ" کے تراجم پیش کر رہے تھے۔ اور اس کا میرے ذوق پر بڑا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کا "خارستان، گلستانِ شیرازہ" شایع ہوا تو میں اسکی تقلید سے باز نہ رہ سکا۔ اور میں نے متعدد ESSAYS اسی رنگ کے لکھے ——— "ایک شاعر کا انجام، پارسی دوشیزہ، رقاصہ اور عورت اسی تاثر کا نتیجہ تھے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۱۱ء) میرا اور سید سجاد حیدر کا اجتماع مسوری میں ہو گیا۔ وہ پولیٹیکل ملازمت کے سلسلہ میں افغانستان کے ایک امیرزادہ

کی نگرانی پر مامور تھے اور میں ایکسنر اسٹیٹ سے وابستہ تھا۔
مسوری کے دوران قیام میں میں ہر اتوار ان کے پاس صرف کرتا تھا اور سارا وقت ادبی گفتگو میں کٹ جاتا تھا۔ چند دن کے لئے قاری سرفراز حسین دہلوی (سیاح چین و جاپان) بھی یہاں آ گئے تھے اور وہ بھی اس صحبت میں شریک رہتے تھے۔ اس وقت تک یلدرم کی شادی نہ ہوئی تھی
ادبی منظومات میں سرور جہان آبادی کی نظمیں مجھے بہت پسند تھیں، لیکن اقبال کی نظمیں ایک عمیق شاعرانہ احساس میرے اندر پیدا کر رہی تھیں۔ اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال جاری ہوا۔ اور اسکی "انشاء عالیہ" نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اسی زمانہ میں اقبال کا شکوہ شائع ہوا، جس نے مجھے یک لخت نظم نگاری کی طرف مائل کر دیا۔ اور میری پہلی نظم اسی نہج و اسلوب کی "شہر آشوب اسلام" کے عنوان سے الہلال میں شائع ہوئی۔
نظموں کے علاوہ میں نے نثر میں بھی سیاسی و قومی مضامین لکھنا شروع کئے جو زیادہ تر زمیندار میں شائع ہوتے تھے۔
اس وقت کے ادیبوں میں، خان بہادر میر ناصر علی کا اسلوب تحریر بھی مجھے بہت پسند تھا۔ لیکن میں اسکی تقلید نہ کر سکتا تھا۔ ان کی تحریر اردو میں ESSAY WRITING کا بہترین نمونہ تھیں لیکن اول اول اس قسم کے مقالے میں نے انگریزی کے مشہور ESSAYIST ولیم ہزلٹ سے متاثر ہو کر لکھے۔ اسی کے ساتھ میں نے مختصر افسانے بھی شروع کئے اور یہ واقعہ ہے کہ میری افسانہ نگاری زیادہ تر یونان کے صنمیاتی لٹریچر سے متاثر تھی، کیونکہ میں اپنے

وہ تمام جذبات جو عورت سے قبل تھے۔ زیادہ دل کھول کر اس پردہ میں ظاہر کر سکتا تھا۔ اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس میں غالب حصہ ان جذبات کا تھا جو بڑی حد تک "ناکردہ گناہوں" کی حسرت سے تعلق رکھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ٹیگور کی گیتانجلی انگریزی میں شائع ہوئی اور وہ مجھے اسقدر پسند آئی کہ میں نے فوراً اس کا ترجمہ "عرض نغمہ" کے نام سے شائع کر دیا۔ اور ٹیگور کے طرز تحریر تو نہیں لیکن اسکی معنویت سے ضرور میں نے اپنے بعض مضامین میں استفادہ کیا۔

میری ادبی زندگی کے آغاز کے کچھ دن بعد ہی میری صحافتی زندگی بھی شروع ہو گئی اور اس کا آغاز زمیندار لاہور کے ادارہ میں ہوا (سنہ ۱۹۱۱ء) اس کے بعد یہ سلسلہ دہلی میں قائم ہوا (سنہ ۱۹۱۶ء) اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ میری صحافتی زندگی پر مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا انداز صحافت (گو میرا اور ان کا ساتھ ایک بار دفتر زمیندار میں ہو گیا تھا) میں نے بالکل قبول نہیں کیا۔ حالانکہ اپنی جگہ وہ ایک خاص وزن رکھتا تھا۔

اس کے بعد جب سنہ ۱۹۲۲ء میں نگار جاری ہوا تو ادب، سیاست، مذہب اور تنقید سب پر مجھے آزادی کے ساتھ لکھنے کا موقع مل گیا۔ اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ادبیات اور صحافت کے سلسلہ میں مختصراً ان حضرات کا ذکر کر چکا ہوں جنکی تحریروں نے مجھے متاثر کیا۔ رہ گئے میرے سیاسی عقائد سو اس باب میں ایں قدر

اُن چند اکابر کانگریس کا شکرگذار ہوں جو ملک و قوم کی اجتماعیت کو رنگ و نسل کے امتیاز پر ترجیح دیتے تھے۔ اور ان حضرات میں سب سے زیادہ میں مہاتما گاندھی کے مشن سے متاثر ہوا ہوں۔

مذہب کے باب میں مولویوں کے خلاف ایک منفی قسم کا رّدِ عمل جو میرے اندر اول اول پیدا ہوا تھا، نگار کے اجرا کے بعد اس نے زیادہ شدت اختیار کرلی اور اس سلسلہ میں جو جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انھوں نے میری مذہبی آزادی کو اور زیادہ تقویت پہونچائی۔ یہاں تک کہ آج میں تمام علمار کے نزدیک نہایت نامعقول قسم کا مرتد و ملحد ہوں اور میں اپنے اسی الحاد کو عین ایمان سمجھتا ہوں۔

سجاد ظہیر

فرائڈ نے شاید کہیں یہ کہا ہے کہ اپنے بارے میں سچ بولنا ناممکن ہے۔ بھلا کس میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے سارے کرتوت، اپنی اصلی پوشیدہ خواہشات، ذہنی اور دماغی کیفیتیں، وہ سب باتیں جو وہ پوشیدہ اور نیم پوشیدہ کرتا ہے بے کم و کاست بیان کر دے؟ اور پھر بالفرض اگر کسی میں اتنی جرأت بھی ہو اور خود نمائی کی خواہش اس پر اتنی حاوی بھی ہو جائے کہ بھری محفل میں اپنا منہ کالا کرنے میں اسے جھجک نہ محسوس ہو۔ پھر بھی ماہر نفسیات تو یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ دراصل ہمارے کیرکٹر کے بنانے اور بگاڑنے میں، اس میں ان خصوصیتوں کے پیدا کرنے میں جن سے فی الحقیقت ہماری انفرادیت بنتی ہے

ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات اور سانحے اور تاثرات کام کرتے ہیں جن کا ہمیں شعوری طور پر علم بھی نہیں ہوتا۔ اور کسی کی شخصیت کے متعلق ایسا مکمل علم حاصل کرنے کے لئے تحت الشعور کے ایک طویل اور گہرے تجزیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو نفسیات کے بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر ہی کر سکتے ہیں۔

جب سے مجھ سے یہ کہا گیا کہ میں اپنے متعلق کچھ لکھوں اور جن واقعات اور شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا ہے، ان کا تذکرہ کروں، میں یہی سوچ رہا ہوں کہ آخر مجھ سے یہ درخواست کیوں کی گئی؟ اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں نے ادب اور سیاست کے میدان میں تھوڑی بہت شہرت (نیک نامی اور بدنامی) حاصل کر لی ہے اور قومی اسٹیج پر میرا بھی چھوٹا سا رول رہا ہے، تو لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ اداکاری کس طرح ممکن ہوئی تاکہ پھر اس سے وہ بھی کچھ سبق سیکھیں یا عبرت حاصل کریں، اور دوسرے یہ کہ لوگ شاید یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسٹیج کے پردے کے پیچھے میری شکل و صورت کیسی ہے۔ یعنی مایا جال کے اس پار سٹ اور سار کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اپنے ان مہربانوں سے سوال کروں جو اس مضمون کو پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے، یا گوارا کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کو ان دونوں صورتوں میں سے میری کونسی صورت دیکھنے کی خواہش ہے اور ان کی دلی آرزو پوچھوں، تو سب ایک رائے ہو کر کہیں گے، کہ دوسری بات میں ہمیں زیادہ دلچسپی ہے۔ پہلی کے متعلق تو ہم کو تھوڑی بہت واقفیت ہے ہی اور پھر اس میں خاص بات کیا ہے! کشش تو در اصل برہنگی میں ہے، ان باتوں، پہلوؤں اور گوشوں میں عام طور پر چھپے

رہتے ہیں۔ اتقا اور پرہیزگاری کے تمام دعووں اور نمودوں کے باوجود برہنہ حسن کی دلکشی اور جاذبیت اپنی جگہ قائم ہے۔ اگر انسانوں کو پردے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اسی وجہ سے کہ پردہ دری کی خواہش، چاہے وہ جسم کی ہو، یا روح اور نفس کی، اس سے بھی زیادہ تیز اور سخت ہوتی ہے۔

تو آئیے شروع سے شروع کریں اور دعا کیجئے کہ اللہ مجھے سچ بولنے کی توفیق اور طاقت عطا کرے۔ گو کہ میری پیدائش اور پرورش اس صدی کی پہلی دہائی میں لکھنؤ میں ہوئی، گولہ گنج، منشی، اطہر علی کی کوٹھی میں، جہاں میرے والد سید وزیر حسن رہتے بھی تھے۔ اور جہاں ان کی وکالت کی دوکان بھی تھی، لیکن میرے گھر کا ماحول دیہاتی تھا۔ میری ماں اور میرے باپ دونوں جونپور ضلع کے چھوٹے زمیندار خاندان کے دیہاتی سادات تھے۔ ایک ایسا مسلمان خاندان تھا جس میں لکھنے پڑھنے کا چرچا تھا۔ میرے دادا تحصیل دار تھے اور انہوں نے میرے والد کو بڑی مشکلوں سے علی گڑھ سے بی۔ اے اور الہ آباد سے ایل ایل بی پاس کرا کے وکیل بنایا۔ پہلے انہوں نے جونپور اور پھر پرتاب گڑھ میں وکالت شروع کی، پھر لکھنؤ آئے۔ میرے پیدا ہونے تک (میں سات بھائی بہنوں میں چھٹا تھا) وہ کافی خوشحال ہو چکے تھے، لکھنؤ کے چوٹی کے وکیلوں میں گنے جاتے تھے اور کئی ہزار کی آمدنی تھی، لیکن رات کو جب ہم سب بھائی بہن اپنے والدین کے ساتھ کھانے پر بیٹھتے تو بابا اپنے ابتدائی وکالت کے دنوں کی مصیبتوں کا ہم سے تذکرہ کرتے۔ کبھی کبھی دو روپے فیس پر صبح سویرے جاڑوں میں اٹھ کر یکے پر لحاف اوڑھ کر انہیں دس دس میل جانا ہوتا تاکہ ڈپٹی کلکٹروں اور تحصیلداروں

کی عدالت میں، جب وہ دورہ کرتے ہوتے، وقت سے پہنچیں۔ ہماری ماں (جنہیں ہم "بوبو" کہتے تھے) ہم سے بتائیں کہ جب وہ اپنی ساس کے یہاں رہتی تھیں تو کیسی کیسی سختیاں انہیں برداشت کرنا پڑتیں اور ساس کی زبان کے تیر کھاکر بھی چپ رہنا ہوتا۔ بالکل ویسی ہی باتیں جو میری بیوی اپنی ساس کے متعلق کرتی تھیں۔ ہمارے گھر میں دیہات کے نوکر اور نوکرانیاں ہوتے تھے۔ اور پھر کئی کئی بے روزگار چچا، پھپھیاں اور اس طرح کے اور رشتہ دار۔ اور یہ سب جونپور کے دیہاتی سید اور سیدانیاں "لکھنؤ والوں" کی ہمیشہ برائیاں کرتے رہتے۔ ان کے نزدیک لکھنؤ والوں کے "حسب نسب" کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ ان کی بات کا کچھ اعتبار نہیں تھا۔ ہم لوگ گھر میں آپس میں دیہاتی زبان بولتے تھے۔ باہر والوں سے البتہ اسٹینڈرڈ اردو بولنے کی کوشش کرتے۔ لیکن زبان کا فرق نمایاں ہو جاتا۔ لکھنؤ والے ہنس پڑتے تو ہم کو بڑی کوفت ہوتی اور ہم ان سے اور بھی بگڑ جاتے اور کہتے کہ یہ لوگ کتنا بنتے ہیں! بوبو کی ایک خاص نوکرانی تھی "گوری"۔ کہتی تھیں کہ ایک مرتبہ قحط پڑا تھا تو یہ لاوارث ان کے گاؤں آئی اور خرید لی گئی۔ یہ ان کی بہت منہ چڑھی تھی۔ اور اس کے منجملہ کاموں میں ایک کام یہ بھی تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مردانے میں جاکر دیکھ آیا کرے کہ ہم سب بھائی (جارعنؔ علّن، للّے، منے اور بنّے) کیا کر رہے ہیں اور پھر اندر جاکر وہ بوبو سے ہمارے کرتوتوں کی رپورٹ کرتی۔ ان میں سب سے بڑا جرم ہمارا لکھنؤ کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا تھا۔ گوری زور سے چلّاکر بوبو سے کہتی "بوبو دیکھیو، بھیا لکھنؤ کے لونڈن کے ساتھ کھیلت ہن!"ؔ ہماری ماں ہم سب کو، خاص طور پر میرے

ؔ یعنی، "بوبو دیکھئے بھیا لکھنؤ کے لونڈوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔"

بڑے بھائی کو فوراً اندر طلب کرتیں اور ہم پر ڈانٹ پڑتی۔ اس زمانے میں ہم لوگ پرانے لکھنؤ کے بیچوں بیچ وزیر گنج کے محلے میں شاہی زمانے کے ایک بڑے پرانے مکان، "خاقان منزل" میں رہتے تھے۔ اس کے بعض حصے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر تھے، اور زنانے میں جہاں ہم سب کی بود و باش تھی، امام باڑے کو رہنے کی جگہ بنایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک شہ نشین تھی۔ جس میں عَلَم نصب ہوتے ہوں گے۔ اس میں اب گودام تھا، یعنی کاٹھ کباڑ، ٹوٹی پھوٹی چیزیں، پرانے اخبار اور رسالے مٹی، دھول، گندگی اور تاریکی۔ گرمیوں کی دوپہر میں جب بوبو سو جاتیں تو ہم ان کے پاس سے چپکے سے اٹھ کر کبھی اس شہ نشین میں، کبھی باہر کے کھنڈروں، کبھی صحن کی مہندی کی جھاڑیوں کے پیچھے معلوم نہیں کون سے دفینے ڈھونڈا کرتے۔ میرے ساتھی ہمارے نوکروں کے چھوٹے چھوٹے ہم عمر لڑکے ہوتے۔ یہ سب حرکتیں ہماری ماں کو پسند نہیں تھیں، یعنی گندے کونے کھدروں میں جانا، کمینوں کے ساتھ کھیلنا، دوپہر میں آرام کرنے کے بجائے چپکے سے کھسک جانا اور دھوپ اور لُو میں بے مقصد ڈھنکنا۔ لیکن یہی اس زمانے میں ہماری سب سے بڑی خوشیاں تھیں۔ اس زمانے کی کتنی ہی باتیں بھول گئیں لیکن وہ کھنڈر، وہ شہ نشین، باغیچے کی جھاڑیوں کے پیچھے کی کانٹوں اور گرد کی دنیا کیوں نہیں بھولتی؟

ہم چھ سات برس کے رہے ہوں گے کہ آزادی اور خوشی اور بےفکری کی اس رنگ برنگی دنیا پر جیسے ایک بجلی گری۔ میری "بسم اللہ" کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور دوسرے دن سے مجھے باقاعدہ مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ میرے بڑے بھائیوں کو "دینیات" عربی اور فارسی پڑھانے کے لئے ہمارے

والدین نے ایک عالم فاضل مولوی کو ہمارے گھر پر ہی رکھ لیا۔ ان کو بیس روپے ماہوار کھانا ملتا تھا۔ وہ جائس کے بڑے مشہور عالموں کے خاندان کے ایک فرد تھے۔ دبلے، لمبے خس خسی ڈاڑھی، عمر کوئی تیس پینتیس سال کی ہوگی۔ مولوی رضی حسن صاحب پیش نماز تھے۔ ہم سب بھائی سورج نکلنے کے پہلے ہاتھ منہ دھو کر سیدھے ان کے کمرے پر جاتے، صبح کی نماز پڑھتے۔ اس کے بعد قرآن شریف لیکر بیٹھ جاتے۔ ایک رکوع کی تلاوت کرتے۔ مولوی صاحب سنتے رہتے اور ہمیں صحیح قرأت سکھاتے۔ بعد کو ہم میں سے ایک مولوی صاحب کا حقہ بھرتا اور پھر، پہلے عربی اور اس کے بعد فارسی کا سبق ہم کو دیا جاتا اور خوشخطی کی تختیاں لکھتے۔ مولوی صاحب تخت پر بیٹھتے، ہم لوگ کرسیوں پر جو تخت کے بالکل قریب ہی لگی ہوتیں۔ کتاب ہماری گود میں ہوتی۔ ہم پڑھتے۔ مولوی صاحب سنتے۔ پہلے آموختہ پھر نیا سبق۔ یہاں کی ساری فضا رعب داب اور تقدس کی ہوتی۔ کوئی غلطی ہوئی اور مولوی صاحب "ہوں" کہہ کر چیں بجبیں ہو جاتے۔ میری جان سوکھ جاتی۔ کبھی کبھی کان اینٹھ کر چانٹا بھی مار دیتے۔ دوپہر کو ظہر و عصر اور شام مغرب و عشاء کی نماز کیلئے مولوی صاحب کے یہاں جانا پڑتا۔ مجھے مولوی صاحب سے بری طرح ڈر لگتا تھا۔ حد یہ تھی کہ میں ایسے میں بھی جب مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا تھا، اس طرف جانے سے کتراتا تھا۔ ان کی آواز بڑی کرخت تھی۔ دیکھ لیتے زور سے پکارتے، "بچے! یہاں آؤ" اور پھر کوئی نہ کوئی فرمائش کرتے، "اندر جا کر اپنی والدہ سے کہو تھوڑی سی شکر بھیجدیں" یا اسی قسم کی کوئی اور بات۔ ہماری بوبو بھی ان کی فرمائشوں سے عاجز رہتیں

لیکن عام طور سے ان کو پورا کرتی تھیں۔ وہ ان کا بہت احترام کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ان کے رہنے سے گھر میں "برکت" ہوتی ہے۔ ہمارے بابا روزہ نماز کے پابند نہیں تھے۔ وہ صرف عید بقرعید کی نماز پڑھتے تھے۔ اسی لئے ہماری ماں نے مولوی صاحب کو رکھا تھا۔ کہ باپ کے اثر سے نہیں تو مولوی صاحب کے اثر سے ہملوگ پابند صوم و صلوٰۃ ہوں اور اچھے مسلمان بنیں لیکن اس نسخہ کا کچھ الٹا ہی اثر ہوا۔ البتہ کسی قدر عربی فارسی ہمیں ضرور آگئی۔ بوبو بیچاری اس کو غنیمت سمجھنے لگیں اور کبھی کبھی اپنی میٹھی دیہاتی بولی میں بڑے فخر سے کہتیں: "مورے بٹوئے[2] عربی فارسی جانت ہیں۔" میں نے ان مولوی صاحب سے کوئی چھ سات برس تک تعلیم حاصل کی، دینیات اور اخلاقیات کے سبق کے لئے اور نمازیں پڑھیں۔ آج اتنے برس بیت جانے پر بھی اس تلخی کی یاد دل پر نقش ہے، اور کوئی سبق مجھے مولوی رضی حسن صاحب مرحوم سے ملا ہو یا نہ ملا ہو، اس بات کا مجھے عملی تجربہ ضرور ہے۔ اور اس لئے یقین ہے کہ اچھائیاں اور نیکیاں شدت اور جبر کے ساتھ ہرگز کسی کو سکھائی نہیں جا سکتیں۔ اور یہ کہ زہد و پارسائی بسا اوقات انسان کی انسانیت کو کم کر کے اسے شقی القلب مغرور اور خودپرست بنا دیتے ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب برے آدمی بالکل نہیں تھے، دنیا کو صراط مستقیم پر لگانے کی دھن نے انہیں برباد کر دیا تھا۔

ایک ہمارے جھنگڑی ماموں تھے۔ بوبو کے رشتے کے بھائی۔ یہ بھی خاقان منزل کے مردانے کی بیشمار کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری میں رہتے تھے۔ گاؤں سے شہر آئے تھے نوکری کے لئے۔ بابا کبھی کبھی کوشش کرکے

---

[2] پوربی بولی میں بیٹے کو پیار سے "بٹوا" کہتے ہیں

انہیں کسی دفتر میں کلرکی دلوا دیتے تھے۔ ان کی تنخواہ کبھی پچیس تیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ لیکن وہ زیادہ تر بے روزگار رہتے تھے۔ کسی نہ کسی بات پر نوکری چھوٹ جاتی تھی۔ کھانا رہنا تو ہمارے یہاں تھا ہی۔ بوبو بھی ان کو خرچ کے لئے کچھ دے دیا کرتی تھیں۔ بالکل نحیف دُبلے پتلے تھے۔ چالیس سال کے رہے ہونگے۔ گندمی رنگ، ڈاڑھی منڈی، مونچھیں اوپر کے لب بے پروائی سے کٹی ہوئیں۔ گرمیوں میں لکھنؤ کی دوپلی ٹوپی اور انگرکھا پہنتے تھے۔ وہ ہمارے گھر کا عام کام کاج، ایسا جو "شریف آدمی" کے لائق ہو کیا کرتے۔ مثلاً بازار سے کپڑے خرید کر لانا، مہینے کے شروع میں منڈی سے جنس ٹھیلے پر لدوا کر لانا، بست و یکم رمضان (حضرت علی کی شہادت کی تاریخ) کے موقعے پر مجلسوں کا بندوبست کرنا، باورچی یا نوکر بھاگ جائیں تو نئے آدمی ڈھونڈ کر لانا، ہم سب بھائیوں کی عام دیکھ بھال کرنا وغیرہ۔ جھنگری ماموں بڑے شوقین آدمی تھے۔ حقہ تو خیر پیتے ہی تھے، ان کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ افیون بھی کھاتے ہیں۔ ان کے تین شوق تھے: اردو کے اخبار، رسالے اور ناول پڑھنا، شام کو چوک یا امین آباد کی سیر کو جانا اور عشق بازی۔ میں بہت چھوٹی عمر کا تھا، اس لئے ان کی "رات کی زندگی" کے بارے میں کوئی براہ راست واقفیت تو نہیں رکھتا تھا، لیکن اِدھر اُدھر سے لوگ بوبو سے رازدارانہ انداز میں جب آکر باتیں کرتے تو میں ان کا زانو پکڑے اور اپنا سر ان کی گود میں چھپائے بہت سی باتیں سنا کرتا۔ کچھ سمجھ میں آتیں اور کچھ نہ آتیں۔ مثلاً کسی نے آکر جب بوبو سے کہا، "اے ہنی سُنّت ہیو[۳]، جھنگری میاں تو ستیلائن سے پھنسے ہیں۔" تو میری یہ تو سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا ہے

---

[۳] یعنی، ارے بہن سنتی ہو۔

لیکن، اتنا ضرور سمجھا کہ کوئی ایسی بات ہے جو بری بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ان ستیلائن کو میں بھی جانتا تھا۔ یہ تین بچوں کی ماں تھیں۔ ہمارے یہاں جو سائیس تھے ستیل، ان کی بیوی۔ ان کی عمر کوئی تیس برس کی ہوگی۔ گندمی رنگ، گدبدا جسم، چھوٹا قد، بڑی بڑی آنکھیں۔ بے حد محنتی اور ہنس مکھ۔ ان کا لڑکا، بدیسی ہیرا سب سے بڑا دوست تھا۔ اور وہ مجھ سے بھی بہت محبت کرتی تھیں۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اپنے "مرد" ستیل سائیس کے ساتھ رہتیں۔ میں ہر وقت ان کو کام میں ہی مصروف پاتا۔ کھانے پکانے، برتن دھونے اور مانجھنے، کپڑے دھونے اور سکھانے کے علاوہ گھاس چھیلنے بھی جاتی تھیں۔ اور پھر ان کا ایک بڑا کام گھوڑوں کی لید جمع کرکے اس کی اُپلیاں پاتھنا بھی تھا۔ ہمارے یہاں اس زمانے میں تین گھوڑے تھے۔ ایک تو بڑی لینڈو کے لیے مشکی گھوڑوں کی جوڑی تھی۔ اور ایک گھوڑا چھوٹی فٹن میں جوتا جاتا تھا۔ ستیل سائیس انہی پر نوکر تھے۔ وہ سب سے ہنس کر باتیں کرتی تھیں۔ کام کر رہی ہیں اور بولتی جارہی ہیں۔ ستیل سائیس برخلاف بہت ہی خاموش آدمی تھے۔ رات کو جب ستیل ستیلائن اکٹھے ہوتے، تو ستیل کی آواز تو کبھی بھی سنائی نہیں دیتی تھی، ستیلائن کی آواز اور قہقہے دُور دُور تک گونجتے۔ گھر کے دوسرے نوکر بھی کھنچ کھنچا کر ان کی ہی ڈیوڑھی پر پہونچ جاتے۔ ستیلائن سب سے ہنستی بولتی تھیں۔ ستیل دن بھر کام کرنے کے بعد چپ بیٹھے ناریل کا حقہ پیتے رہتے۔ ستیلائن بیچاری عام طور سے میلی کچیلی ساری پہنے رہتیں، لیکن تیوہاروں پر وہ بھی سنگار کرتیں۔ بسنت کے دن ان کی بسنتی ساری کی پھبن مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اور ان کی

بڑی بڑی آنکھوں کا کاجل اور کڑوے تیل سے چمکتے ہوئے گھنے سیاہ
بالوں میں سیدھی مانگ کا سیندور۔ سیتل کی تنخواہ دس روپیہ ماہوار تھی۔
میرا خیال ہے کہ گھاس اور کنڈے بیچ کر ستیلائن بھی اتنا ہی کما لیتی رہی ہونگی
اس آمدنی میں دونوں میاں بیوی اور تین بچے بسر اوقات کرتے تھے۔
مجھے یاد ہے کہ جب میں نے یہ سنا کہ ستیلائن جھنگری ماموں کے ساتھ "پھنسی"
ہیں تو میں فوراً دوڑ کر باہر گیا اور ان کو دیکھتا رہا۔ وہ بیٹھی برتن مانجھ رہی
تھیں۔ میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں کہ اس بات کے کیا معنی ہیں، لیکن اتنا
شعور مجھے ہو گیا تھا کہ یہ کوئی بری بات ہے۔ اس لئے کچھ کہنے کی ہمت نہیں
ہوئی۔ اس دن کے بعد سے میں جھنگری ماموں اور ان کو جب بات کرتے
دیکھتا تو دل میں سوچتا شاید اسی کو پھنسنا کہتے ہیں اور میری سمجھ میں نہ آتا
کہ اس میں برائی کی کونسی بات ہے۔ اس الزام کے باوجود میں اپنے ماموں
اور ان کی محبوبہ کو پسند کرتا رہا۔ بلکہ میری دلچسپی ان میں کچھ بڑھ ہی گئی۔ بات
یہ تھی کہ اس زمانے میں بڑی عمر کے لوگوں میں ہمارے دوست اور ہمدرد
یہی دو تھے، جھنگری ماموں اور ستیلائن۔ اور ان دونوں سے زیادہ دلچسپ
ہمارے لئے اور کوئی دوسرا نہیں تھا۔ جب ہماری عمر آٹھ نو برس کی ہوئی تو
ہم کو اردو پڑھنا آ گیا تھا۔ جھنگری ماموں کی کوٹھری میں اردو ناولوں کا انبار
لگا رہتا۔ وہ پلنگ پر لیٹے عینک لگائے انہیں پڑھا کرتے۔ میں چپکے سے ان
کے کمرے میں داخل ہوتا اور کوئی نہ کوئی ناول لیکر جیسے بھی بنتا پڑھنا شروع
کر دیتا۔ اسی زمانے سے میں نے ناول پڑھنے شروع کیے۔ وہ ان کتابوں

کے مقابلے میں جو مجھے مولوی صاحب سے یا بعد کو اسکول میں پڑھنا پڑتیں، کتنے زیادہ دلچسپ تھے! خوبصورت ہیروئن، بہادر ہیرو، بدمعاش، برے اور دھوکے باز لوگ جو ہیرو ہیروئن کو پیار محبت کرنے سے روکتے۔ کتنی مزیدار اور خوشگوار تھی وہ خیالی دنیا۔ زیادہ تر یہ وہ ناول تھے جن کو آج کل رومانی یا جاسوسی کہا جاتا ہے، یا پھر شرر کے ناول۔ ان کے نام کتنے دل کو لبھانے والے تھے: فلورا فلورنڈا، ملک العزیز ورجینا، بہشت بریں اور پھر وہ اتنا دلچسپ ناول حسن کا ڈاکو۔ میری ماں مجھے ان ناولوں کے پڑھنے سے روکتیں، لیکن جھنگری ماموں کے یہاں سے ان کی لگاتار سپلائی جاری رہتی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ جب ماموں نہیں ہوتے تو میں چپکے سے ان کے کمرے میں گھس کر ان کے انباریں میں سے (یہ ناول ہمیشہ ایک پر ایک رکھے رہتے) کوئی ناول نکال لیتا۔ اور پھر کسی کونے میں چھپ کر، ماں کی نظر بچاکر، دوپہر کو یا رات کے وقت انہیں بے تحاشہ پڑھتا۔ ختم کرنے کے بعد پھر جاکر انہیں واپس رکھ آتا۔ جھنگری ماموں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہمارا نظام تعلیم اور اخلاق اور مذہبی تربیت کا طریقہ کتنا ناقص اور مجہول ہے کہ معمولی طور پر اس سے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو اگر کچھ سیکھنے کو ملتا بھی ہے تو کتنی ذہنی اور روحانی اذیت کے ساتھ ساتھ! کیا کم عمر معصوم دلوں کو اس بری طرح سے دکھ پہونچانا ضروری ہے؟ چالیس سال سے زیادہ گذر گئے ہیں، ابھی تک اس نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ہم اگر کچھ سیکھتے بھی ہیں اور ہمارے ذہن میں کچھ

کشادگی اور روشنی بھی آتی ہے تو اس اذیت اور کوفت کے باوجود۔ شکر ہے کہ مجھے میرے جھنگری ماموں مل گئے تھے۔ اور اندازہ لگانا مشکل ہے کہ میرے اور میری طرح کے دوسرے افراد کے کیرکٹر کو ایسی "تربیت" سے کتنا نفسیاتی نقصان پہونچا ہوگا!

(۲)

ہمارے گھر کی سیاسی فضا آزادی خواہی کی تھی۔ میرے والد مسلمان لیڈروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کانگریس کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے سامنے ہندوستان کے لئے ذمہ دار حکومت کا مطالبہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں مسلم لیگ کے سکریٹری تھے۔ اور ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا پیکٹ ہوا تو اس میں وہ پیش پیش تھے۔ لکھنؤ میں قیصر باغ کی بارہ دری میں لیگ کا وہ سیشن مجھے اچھی طرح یاد ہے جس میں کانگریس کے لیڈر بھی شریک تھے، گاندھی جی، مسز سروجنی نائیڈو، بال گنگادھر تلک، جناح صاحب کو میں نے پہلی بار اسی زمانے میں دیکھا۔ کانگریس کے اس اجلاس کے صدر بابو امبکا چرن مزمدار تھے۔ لیکن سب سے بڑے لیڈر تلک تھے میں اپنے بھائیوں کے ساتھ امین آباد میں تھا جب تلک کا جلوس وہاں سے گذرا۔ ہم پارک کے کنارے پر اپنی گاڑی میں بیٹھے تھے کہ جم غفیر نے ہمیں آ لیا۔ لوگ والہانہ انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ "بولو تلک مہاراج کی جے" "تلک مہاراج

اور ان کے ساتھ تین چار آدمی ایک کھلی ہوئی لینڈو گاڑی میں ہاروں اور پھولوں سے لدے بیٹھے تھے۔ گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے گئے تھے اور لوگ اسے خود کھینچ رہے تھے۔ مجھے یہ سب بہت ہی اچھا معلوم ہوا۔ اتنے میں چیختے چلاتے پھول برساتے اور آگے بڑھتے ہوئے مجمع میں مَیں نے آشارام کو دیکھا۔ یہ ایک چھوٹے سے قد کے پنجابی ٹھیکے دار تھے جو ہمارا نیا مکان بنوا رہے تھے۔ ہمارے گھر روز ان کا آنا جانا رہتا۔ وہ بھی جوش میں زمین سے گز گز بھر اچھل رہے تھے۔ وہ سفید پگڑی باندھتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی پگڑی جو ہمیشہ صاف ستھری اور چست بندھی ہوئی ان کے سر کی زینت ہوتی، کھل کر ان کے گلے اور کندھوں پر لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے حیرت سے آشارام کی طرف دیکھا کہ ان مُقَطَّع آدمی کو جو ہمیشہ ہمارے والد سے اینٹ اور چونے اور مزدوروں کی مزدوری کے لئے روپیہ مانگنے آیا کرتے تھے، کیا ہو گیا ہے! انہوں نے بھی ایک لمحے کیلئے مجھے دیکھا اور مسکرائے اور پھر میرے قریب آکر زور سے "تلک مہاراج کی جے" چلائے اور آگے مجمع کے ریلے میں بہہ گئے۔ میں بھی زور سے چلایا "تلک مہاراج کی جے"۔ ضرور تلک مہاراج بڑے اچھے آدمی ہونگے، میں سوچتا رہا۔

اسی زمانے میں مَیں نے مسز سروجنی نائیڈو کو پہلی دفعہ دیکھا۔ ان سے باتیں کیں اور ان کی تقریر سنی اور خفیہ طور پر ان کا دلدادہ ہو گیا۔ بابا مسز سروجنی نائیڈو کو جانتے تھے۔ جب وہ لکھنؤ آئیں تو ایک دن بابا نے اندر آکر بوبو سے کہا: "مسز نائیڈو تم سے ملنے آنا چاہتی ہیں۔ کل شام چائے پر

ان کو مدعو کر دیا ہے۔ تیار رہنا۔" میری ماں اس زمانے میں پردہ کرتی تھیں کسی بے پردہ عورت سے ان کا ملنا شاذ و نادر ہوتا تھا۔ "تیاری" کے معنی یہ ہوئے کہ بازار سے خوب بہت سے کیک مٹھائیاں اور پھل منگائے جاتے، چائے کے چاندی کے برتن اور اعلیٰ درجے کی چائنا کا سیٹ نکالا جاتا۔ ڈرائنگ روم کی خوب صفائی ہوتی، بوبو نہا دھو کر اپنے معمولی کپڑوں (جو یوپی کی بی بیوں کا تنگ مہری کا پائجامہ، کرتا اور ڈوپٹہ) کے بجائے بہت ہی ہونق قسم کا "سایہ" پہنتیں جس کے اوپر سے وہ ہندوستانی عیسائی عورتوں کی طرح ڈوپٹہ بھی اوڑھتی تھیں۔ ہماری بہنیں ریشمی کپڑے پہنتیں، ہم بھائیوں کو صاف کرتے پائجامے شیروانیاں اور ٹوپیاں پہنائی جاتیں، نوکروں کو صاف وردیاں پہنائی جاتیں (مہمان کے آنے کے تھوڑا ہی پہلے تاکہ میلی نہ ہو جائیں) اور سارے گھر میں ایک تناؤ کی سی مصنوعی کیفیت پھیل جاتی۔ زنانی پارٹیوں اور دعوتوں میں ہمارے یہاں ہمیشہ ایک بڑا کٹھن مسئلہ یہ ہوتا تھا کہ انگریزی کھانا پکانے والا خانساماں اور بیرا اندر تو آ نہیں سکتے تھے۔ میز پر ٹھیک سے پلیٹیں کون لگائے؟ کھانے کا سامان کس طرح قاعدے کے ساتھ سب کے سامنے لیجایا جائے؟ چائے کیسے انڈیلی جائے؟ چھری کانٹے چمچے وغیرہ کا استعمال ہم لڑکوں کو تو آ گیا تھا لیکن ہماری ماں کو ان لوازمات سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ انگریزی فیشن کی پابندی ان بیچاری کو بھی کرنا ہوتی۔ اور اس طرح کی پارٹیوں میں ہمیشہ ان سے کوئی نہ کوئی "غلطی" سرزد ہو جاتی! بابا کی ہدایتوں کے مطابق وہ بھی انگریزی طریقے برتنے کی کوشش کرتیں، لیکن جب ان کو بار بار یہ ہدایتیں

ملتیں تو وہ جھلا کر کہہ پڑتیں، "مو کا اس سب ناہیں آوَت ہے*" ہم سب بھائی بہن بھی اس انتظار میں رہتے کہ دعوت کسی طرح جلدی ختم ہو، ہماری نمائش اور گھر کی بناوٹی فضا ختم ہو۔ چنانچہ جیسے ہی آخری مہمان رخصت ہوتا ہم سب شیروانی اور ٹوپی اتار کر بے تحاشہ کھانے کی مزے مزے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑتے مہمان کے سامنے کیک اور مٹھائی کے چند ہی لقمے باقاعدگی سے پلیٹ میں رکھ کر ہمیں ملتے تھے۔ اسکی کمی کو پورا کرنے کیلئے ہم دونوں ہاتھوں سے لپک لپک کر سب اچھی اچھی چیزیں جی بھر کے کھاتے۔ ہمیں دعوت نہیں، سارے وقت دعوت کے خاتمے کا انتظار رہتا۔

لیکن مسز نائیڈو کی دعوت کے دن ان تمام رسموں کے برت جانے کے باوجود کیفیت ہی بالکل دوسری تھی۔ اس عورت میں ایک غیر معمولی حسن تو تھا ہی، بنگال کا جادو اور دکن کا رس، کنول نین، ان کی ہنسی ایسی بے ساختہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا سارا جسم ہنس رہا ہے۔ اور باتوں میں شگفتگی اور تازگی تھی کہ جیسے چاروں طرف زندگی کے پھول کھل جائیں اور ان کی مہک سے روح تر و تازہ ہو جائے۔ ہمارے گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے چاروں طرف مسکرا کر کچھ اس طرح سے دیکھا اور ہماری ماں سے گلے مل کر کچھ ایسی گھل مل گئیں، اس کے باوجود کہ وہ خود اتنی پڑھی لکھی، اتنی بڑی شاعرہ اور اتنی بڑی لیڈر تھیں، اور ہماری ماں دیہات کی ایک بیوی، جو سوائے قرآن شریف اور تھوڑی بہت اردو کے اور کچھ بھی نہیں پڑھی تھیں، کہ ہم سب سمجھے کہ یہ تو دراصل ہماری خالہ جان ہیں۔ انہوں نے فوراً ہماری ماں سے بابا

---

* مجھے یہ سب نہیں آتا۔

نے مشترک دوستوں اور ان کی بیویوں کے متعلق اسکینڈلوں کی باتیں شروع کر دیں۔ "اے بہن، اس بڈھے کھوسٹ بھوتنے کے بارے میں کچھ سنا ہے کہ دوسری شادی کر رہا ہے۔" اور "فلاں بیوی کو دیکھا ہے آپ نے! موٹی ہتھنی کی طرح ہیں، اور کالی بھجنگ، گال سوکھ کے کشائی ہو گئے ہیں اور کپڑے اور زیور پہنتی ہیں نئی نویلی دلہنوں کی طرح۔" ہماری ماں کے بارے میں مسز نائیڈو نے معلوم نہیں کہاں سے معلوم کر لیا تھا کہ لکھنؤ کی ایک بیگم صاحبہ سے نفرت کرتی ہیں۔ بس پھر تو دونوں نے ان کے بخئے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ اس سے بڑھ کر دوستی کی مضبوط بنیاد اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ کسی کے ساتھ مل کر کسی دوسرے کی برائی کی جائے! چلتے چلتے، دوستی کی بازی جیتنے کے لئے مسز نائیڈو نے یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا کہ حیدرآباد کے اچھے مسلمان خاندانوں میں کئی لڑکیاں ان کی نظر میں ایسی ہیں جن سے ہمارے بڑے بھائیوں کی نسبت کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے، چاند ایسی صورت، گوری چٹی، پڑھی لکھی، شریف خاندان، اور خانہ داری سے واقف ......" ہماری ماں کے لئے جو پانچ لڑکوں اور دو لڑکیوں کی ماں تھیں، اپنی اولاد کی شادی سے زیادہ اہم دنیا میں اور کوئی بات نہ تھی۔ اب تو وہ بالکل مسز نائیڈو کی گرویدہ ہو گئیں۔ لیکن مسز نائیڈو صرف ہماری ماں سے ہی گفتگو نہیں کرتی رہیں۔ ہم سب بھی ان کے ارد گرد بیٹھے تھے، ہر ایک سے تھوڑی دیر بعد وہ ہنس بول لیتیں۔ جب وہ اٹھ کر چلیں تو ہم سب کے دل اپنے ساتھ لیتی گئیں۔

اس کے دوسرے دن میں نے مسز نائیڈو کو پہلی بار تقریر کرتے سنا۔ قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں کانگریس کے لیڈر ہندو مسلم پیکٹ پر دستخط ہو جانے کے بعد، مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کیلئے آئے تھے۔ یہ سمجھوتہ، گو کہ اوپر کے طبقوں کا تھا، لیکن اس کی وجہ سے فضا میں جیسے امید اور خوشی کی مہک پھیل گئی تھی۔

اسی دن غالباً پہلی مرتبہ وطنی آزادی اور قومی اتحاد کا پہلا احساس مجھ میں بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوا۔ اسی دن میں نے پہلی مرتبہ گاندھی جی کو بھی دیکھا۔ ان کا لباس یعنی سر پر سفید پگڑی سفید کوٹ، گول چہرہ ڈھلکتا ہوا ہوا رنگ اور سیاہ مونچھیں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ اس کے بعد جب میں نے گاندھی جی کو سنہ ۱۹۲۰ء میں دیکھا (یعنی تین چار سال بعد) تو ان کی حیثیت اور شکل صورت کافی بدلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کس نے جو ہال میں میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا گاندھی جی کو دکھا کر کہا تھا۔ "یہ گاندھی ہیں۔ انہوں نے ساؤتھ افریقہ میں بڑا کام کیا ہے!" لیکن اس زمانے میں کئی دوسرے لیڈر گاندھی جی سے بڑے مانے جاتے تھے۔ مسز نائیڈو بلبلِ ہند مشہور ہو چکی تھیں۔ سب ان کی ہی تقریر سننے کے لئے بے چین تھے۔ ظاہر ہے کہ اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ اس دن کی تقریر میں انہوں نے کیا کہا، لیکن تقریر کرتے وقت ان کی تنی ہوئی بھوئیں، ان کے الفاظ کا ترنم اور ان سب سے جس جوش و خروش کی کیفیت پیدا ہوئی تھی، وہ ابھی تک میرے دل پر نقش ہے۔ اور مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے آزادی کے لئے جد و جہد کرنے کی جو تلقین اپنی تقریر

میں کی تھی اسے حافظ کے اس شعر پر ختم کیا تھا :-

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اول اینست کہ مجنوں باشی

مسز نائیڈو کے منہ سے فارسی کا شعر سُن کر لکھنؤ والے کتنے خوش ہوئے ہوں گے !

(۳)

ہمارے گھر میں انگریزی راج سے نفرت کی جاتی تھی۔ یعنی گھر کے بالکل اندر، دلوں میں۔ باہر تو یہ کیفیت تھی کہ نیشلسٹ خیال کے ہونے باوجود جب نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو بابا سیاست سے علیحدہ ہوگئے۔ وہ اس تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن اس کے لئے جو قربانیاں درکار تھیں یعنی وکالت چھوڑ دینا (بعد کو وہ اودھ کے جوڈیشنل کمشنر اور پھر چیف کورٹ کے جج ہوگئے) اس کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔ گھر کا خرچ، کھانا پینا، بچوں کی تعلیم، کافی اونچی سطح کی امیرانہ زندگی، ان سب کا دارومدار ان کی روزانہ کی محنت پر تھا۔ وہ بہت محنت کرتے تھے اور بہت کافی کماتے تھے۔ لیکن جتنا کماتے تھے اس سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ پھر دو باتیں اور بھی تھیں، انہیں گاندھیائی نظریے کے مطابق سادہ زندگی، کھدر پوشی وغیرہ سے بھی سخت چڑ تھی۔ دوسرے یہ کہ اس تحریک میں جو

مذہبی رنگ تھا، خاص طور پر اس کا خلافتی پہلو، اس سے وہ قطعی ہم آہنگ نہیں تھے۔ وہ عملی طور پر ایک ایپی کیورین تھے۔ اچھے کپڑے، لذیذ کھانے پینے، نفیس ماحول، دوستوں اور احباب کے ساتھ خوش باشی، موسیقی اور خوبصورت عورتوں کی صحبت، یہ سب باتیں انہیں پسند تھیں۔ مذہبی معاملات میں رواداری اور عقلیت پسندی ان کا شیوہ تھا۔ بہت اچھے قانون داں ہونے کی وجہ سے ان کی باتیں بڑی منطقی ہوتی تھیں۔ رام راج اور خلافت کا وہ ہمیشہ مذاق اڑاتے تھے۔ ان باتوں کو دقیانوسیت اور قدامت پرستی پر محمول کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے ہمارے گھر کی کیفیت عجیب متضادسی تھی۔ ایک طرف تو آزادی کی تحریک سے گہری ہمدردی تھی۔ نان کوآپریشن کی تحریک کے لیڈروں میں سے کئی سے بابا کی ذاتی دوستی اور ملاقات تھی۔ اور ہمارے گھر میں ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ اور بابا چھپاکر ان کو چندہ بھی دیا کرتے تھے۔ دوسری طرف جج ہونے کے بعد سرکاری نوکر بھی ہوگئے تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں میں جانا اور انگریزی سرکار کے تمام نمائشی کاموں میں دکھاوے کی شرکت بھی کرتے تھے۔ تھوڑے دن بعد سرکار سے ان کو خطاب بھی مل گیا۔

نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک جب شروع ہوئی تو میں میٹرک میں پڑھتا تھا، میری عمر کوئی پندرہ سال کی ہوگی۔ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ مجھ پر اس تحریک کا اثر پڑا۔ معلوم نہیں کیوں؟ ہم جوبلی ہائی اسکول میں پڑھتے تھے جو شہر کے اندر تھا۔ اور ہمارے نئے مکان وزیر منزل سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ روز صبح شام کو ہم تانگے یا ٹن ٹن سوار

ہو کر اسکول جاتے۔ آتے جاتے راستے میں موتی محل کا پُل پڑتا۔ شہر کے تین مشہور کانگریسی لیڈر پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا، چودھری خلیق الزماں اور ایک مدراسی رنگا آئیر سارے وقت اس پُل کے نیچے کے ایک چبوترے پر کیننگ کالج کے نزدیک (اس وقت تک لکھنؤ یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی) کھڑے تقریر کرتے رہتے۔ اور کالج کے لڑکوں سے کہتے تھے کہ کالج چھوڑ کر نکل آئیں، انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ کریں، سوراج کی لڑائی میں کود پڑیں وغیرہ۔ میں اپنی گاڑی رکوا کر ان جلسوں میں کھڑے ہو کر گھنٹے دو گھنٹے ان تقریروں کو سنتا۔ اس کے علاوہ ہر طرف بدیشی کپڑوں کے انبار لگا کر ان کو آگ لگا دی جاتی۔ الہ آباد سے سید حسین مرحوم کی اڈیٹری میں انڈپنڈنس اخبار شائع ہوتا، جس میں بڑے زوردار مضمون ہوتے تھے، اسے پڑھتا۔ اس کے بعد جب گاندھی جی اور علی برادران پہلی مرتبہ لکھنؤ آئے تو اسکول کے سب لڑکوں کے ساتھ ہم بھی کلاس چھوڑ کر ان کے درشن کرنے اور ان کی تقریریں سننے کے لئے چارباغ اسٹیشن کے سامنے کے میدان میں پہونچ گئے۔ ہر جگہ سے اسٹرائیک، بائیکاٹ، جلسوں، جلوسوں اور پولیس کے ساتھ تصادم کی خبریں آتیں۔ جلیان والہ باغ کی فائرنگ کا چرچا رہتا، روسی انقلاب کی خبریں آتیں، لکھنؤ کے گلی کوچوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے بڑی اچھی دھن میں گانے گاتے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور یہ تھا:

بولی اماں محمد علی کی ، جان بیٹا خلافت پہ دیدو

ایک دوسری نظم جو لکھنؤ میں بہت گائی جاتی تھی اس کا پہلا مصرع یہ تھا:

اسیر د کرد کچھ رہائی کی باتیں

گاندھی جی کا ینگ انڈیا ہر ہفتے آتا اور اس کا ایک ایک حرف لوگ احترام اور شوق سے پڑھتے۔ پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ لکھنؤ کے پاس لکھیم پور کے ضلع میں خلافت کے ایک والنٹیر نے وہاں کے انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ولیوبی کے گھر میں گھس کر تلوار سے اس کا سر کاٹ دیا۔ دوسرے دن ہمارے گھر میں لکھنؤ کے انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سٹرزٹ رج گھبرائے ہوئے بابا سے ملنے کے لئے آئے۔ یہ بھی ایک عجیب بات تھی اس لئے کہ میرے والد گو کہ عہدے کے لحاظ سے ان سے اونچے درجے کے تھے۔ لیکن انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کبھی ہمارے گھر پر آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ گاندھی جی اور کانگرس اور خلافت نے لیڈروں نے اس قتل کی مذمت کی لیکن میں دوسرے عام ہندوستانیوں کی طرح اس واقعے سے خوش ہی تھا۔ ناراض نہیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ خبریں آنے لگیں کہ اودھ کے دیہات میں کسان، زمینداروں کو لگان دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی کسان سبھائیں ہو رہی ہیں۔ اور ان میں یہ خبر پھیل گئی ہے کہ اب تو سوراج ہو گیا، لگان دگان دینے، زمینداروں کی بیگار کرنے اور پولیس کا ظلم سہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں خود ہمارے رشتے کے کئی زمیندار دیہات سے بھاگ کر آئے اور انہوں نے کہا کہ گاؤں میں ان کی جان، مال، عزت آبرو سب خطرے میں ہیں۔ "نیچ اور کمینے کسان سرکشی پر آمادہ ہیں۔" گو میں عمر میں چھوٹا تھا لیکن یہ زمیندار اعزا مجھے خاص طور پر اپنا دکھڑا سناتے۔ بات یہ تھی کہ میں نے ان تمام حالات اور فضا سے متاثر

ہو کر کھدر پہننا شروع کر دیا تھا، سر کے بال منڈا دیئے تھے۔ گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا۔ چٹائی بچھا کر زمین پر سوتا تھا۔ ہمارے خاندان والوں، بابا کے دوستوں اور احباب اور شہر میں عام طور سے یہ خبر پھیل گئی تھی۔ کہ "وزیر حسن کا چھوٹا لڑکا تو کانگرسی ہو گیا ہے۔" میں نے چرخا کاتنا بھی شروع کر دیا تھا اور اپنی ماں اور بہن کو بھی چرخا کاتنے اور کھدر کے جوڑے پہننے پر آمادہ کر لیا تھا میرے والد نے میری ان حرکتوں پر کوئی تعارض نہیں کیا۔ نہ کبھی وہ اس موضوع پر مجھ سے گفتگو کرتے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ مجھے کسی قدر مذہبی غلو بھی ہو گیا تھا۔ پانچ وقت کی نماز، جس سے مولوی رضی حسن صاحب نے کافی بد دل کر دیا تھا اب میں باقاعدگی سے پڑھنے لگا۔ صبح کو تلاوت قرآن بھی کرتا۔ البتہ میں نے اسکول کی تعلیم کبھی نہیں چھوڑی۔ نان کوآپریشن تحریک کے اس پہلو کو برتنے کے لئے میرا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ میں گاندھی جی اور کانگرس کے بتائے ہوئے راستے پر پکا عقیدہ رکھتا تھا۔ مجھے بھی سارے ملک کی طرح اس کا یقین تھا کہ سال بھر میں سوراج مل جائے گا۔ اس سوراج کی شکل و صورت کیا ہو گی یہ مسئلہ صاف نہیں تھا اور جب گاندھی جی نے یہ کہہ دیا کہ ابھی اس کے صاف کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تو مجھے بھی اطمینان ہو گیا۔ پھر بھی جب کبھی کسانوں کی عام بے چینی، بمبئی میں مزدوروں کی ہڑتال کی خبریں آتیں تو میرا دل خوش ہوتا۔ انگریزوں یا انگریزی حکومت کے تشدد کے خلاف ہندوستانیوں کے جوابی حملوں کی خبر سے بھی خوشی ہوتی لیکن جب فوراً ہی بعد گاندھی جی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی طرف سے اسکی مذمت ہوتی تو میں بھی سمجھنے لگتا تھا۔ کہ شاید ہمارے عوام نے غلطی

کی ہے اور گاندھی جی ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن دل میں شبہ باقی رہ جاتا اور ہمدردی عوام اور ان کے عمل ہی کے ساتھ ہوتی۔ مثلاً مجھے یاد ہے جب حسرت موہانی نے احمد آباد کانگریس میں گاندھی جی کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم کو سلطنت برطانیہ سے مکمل آزادی کا اعلان کرنا چاہیئے۔ اور برٹش ایمپائر میں نہ رہنا چاہیئے تو بہت سے دوسرے نوجوانوں کی طرح میں نے اسے پسند کیا۔ لیکن بعد کو گاندھی جی کی دلیلیں پڑھ کر یہ سمجھا کہ وہ زیادہ دانش مندی کی بات کر رہے ہیں۔ اسی طرح آزادی کی جدوجہد میں ہنسا اور اہنسا کا بھی سوال تھا۔

مزدور طبقے کے علیحدہ وجود کا احساس اسی زمانے میں عجیب و غریب طریقے سے ہوا۔ لکھنؤ میں ریلوے کی ورکشاپ ہے۔ یہاں اس وقت کوئی چھ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب نان کوآپریشن تحریک کا بڑا زور تھا، انہوں نے بھی اسٹرائیک کر دی۔ وہ رہنمائی کے لئے مقامی کانگریس کے لیڈروں چودھری خلیق الزماں اور پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا کے پاس پہنچے۔ اس وقت تک مزدوروں کی نہ تو کوئی یونین تھی اور نہ پارٹی۔ چودھری صاحب کے بارے میں میں نے یہ سنا کہ اِدھر اُدھر گھبرائے گھومتے تھے۔ کہ ان ہڑتالی مزدوروں کو کیا صلاح دیں۔ نہ ان کے اور نہ کانگریس کے پروگرام میں مزدور جماعت کے اجتماعی عمل یا تنظیم کا ہی کوئی پروگرام تھا۔ ادھر سے گورنمنٹ کی سختی شروع ہو گئی۔ آخر کچھ دن اسٹرائیک کرنے کے بعد مزدور کام پر واپس چلے گئے۔ ایک موقع پر میری موجودگی میں چودھری خلیق الزماں نے یہ کہا کہ انگلینڈ میں "لیبر یونین" ہوتے ہیں اور "لیبر" پارٹی ہے۔ لیکن یہاں ہم کس نام سے یونین بنائیں۔؟

"لیبر" کا ترجمہ "مزدور" تو اچھا نہیں ہے۔ مزدور تو ہمارے یہاں بڑے گھٹیا معنوں میں استعمال ہوتا ہے! ہماری زبان میں "لیبر" کی قسم کا کوئی شریفانہ لفظ نہیں ہے! اس چھوٹے سے واقعے سے مزدور کی شرافت پر تو اثر نہیں پڑتا، البتہ بعض "شریف" قومی لیڈروں کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے جنہیں مزدور کے لفظ میں نیچا پن محسوس ہوتا تھا! پھر بھی طبقہ واری تفریق کا الزام کمیونزم پر لگایا جاتا ہے!

(۴)

یہ ظاہر ہے کہ میری زندگی پر، یعنی اس کا رخ اور سمت متعین کرنے میں، ہمارے وطن کی قومی آزادی کی جدوجہد اور کمیونسٹ تحریک اور مارکسی نظریۂ حیات نے سب سے زیادہ اور فیصلہ کن اثر ڈالا ہے۔ اوپر کی سطروں میں مَیں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے چند حالات اور واقعات کا ذکر اس غرض سے کیا ہے کہ اس سمت کے متعین ہونے کے ہونے کے باوجود اور اس کے دائرے کے اندر بھی انفرادیت اور شخصیت کا ارتقار ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ذہنی اور شعوری طور پر ایک خیال یا تصور کو صحیح بھی تسلیم کر لیتے ہیں، ہماری عقل ایک بات کو قبول بھی کر لیتی ہے لیکن اپنے طبقے اور خاندان کے خصائل اور اسی قسم کے دوسرے اثرات، عادتیں، توہمات، روایتیں اور جبلتیں خفیہ اور غیر شعوری طور پر ہمارے عمل، حرکات اور سکنات پر اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ ہم

اپنے متعلق طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں، ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم خاص لائحہ عمل کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، تاہم ہمارے عمل اور خود ہماری فکر کو بعض انجانی طاقتیں ایسی جگہ کھینچ لیجاتی ہیں جو اس لائحہ عمل اور ان اخلاقی اصولوں سے کافی حد تک دور ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر یا تو ہم ان اصولوں کی خود نفی کرتے ہیں یا ناکامی کے احساس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب کے معنی دراصل انسان کو اندھی فطرت اور جبلت، تحت الشعور یعنی تمام انجانے، تاریک، نہ سمجھ میں آنیوالے، اتفاقی اور سانحاتی اثرات اور ان سے پیدا ہونیوالی کیفیتوں سے چھٹکارا دلاکر روشن، شعوری، عقلی، سجھی ہوئی اور منظم راہوں پر لے جاتا ہے، ہمارے وہی خواب سب سے خوبصورت اور مسرت بخش ہوتے ہیں جن کی بنیاد حقیقت اور سچائی پر ہو، ہم زندگی میں بار بار شکست کھاتے ہیں، نامرادیاں اور ناکامیاں اپنے ساتھ رنج واندوہ کے خونیں تحفے لئے ہر گھڑی ہمارے اردگرد گردن جھکائے کھڑی آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن یہی ناکامیاں اگر جہد حیات کے طویل اور مسلسل اور متواتر عمل میں ایسے سنگین موڑوں اور ایسی پگڈنڈیوں کی مثال ہوں جن سے گذرنا ہمارے لئے جانکاہ اور دلشکن ہونے کے باوجود ناگزیر اور ضروری ہو اور جس تجربے کے بغیر ہمارا اگلا قدم صحیح پڑ ہی نہ سکے تو رنج والم کے وہی آنسو دُرِ شاہوار بن جاتے ہیں۔ ان ہی سے زندگی کی زیب وزینت ہوتی اور اس کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ فطرت کی تاریک قوتوں اور تاریخ کی ان مجہول طاقتوں کا، جنہیں موت کا پروانہ مل چکا ہے، زندہ اور متحرک

اِنسانوں پر پے در پے حملہ ہوتا رہتا ہے۔ اِن حملوں کا مقابلہ کرنے سے ہی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی سطح پستی سے بلندی کی طرف اُبھرتی ہے، اس میں معنویت، رنگ اور نکہت پیدا ہوتی ہے۔ وہ نکھرتی اور سنورتی ہے۔ اس لئے وہی اثرات اچھے کہے جا سکتے ہیں جو اس عمل میں ہماری مدد کریں، جو فلاست پرستی، خود پرستی اور خود غرضی کی سنگلاخ دیواروں کو توڑیں اور جن کے وسیلے سے توہمات اور بے عقلی، تعصب اور تنگ نظری کے بادل ہمارے دماغ اور ہماری روح پر سے چھٹ جائیں۔

جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس جہادِ اکبر میں سب سے زیادہ جس چیز نے میری مدد کی وہ ہندوستانی عوام ہیں یعنی مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کی وہ جدوجہد ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کو آزاد، خوشحال اور مہذب بنانے کے لئے جاری کر رکھی ہے۔ اور جس کا ایک ناچیز حصہ بننے کا مجھ کو شرف حاصل ہوا ہے۔ اس جدوجہد کی بہترین تنظیم اور رہنمائی میری نظر میں، یہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے کی ہے۔ اس لئے کہ میرے نزدیک موجودہ دور میں سب سے زیادہ باشعور جماعت یہی ہے۔ میرے نزدیک وہ ہماری قوم کی اعلیٰ ترین تہذیبی روایتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ جس مارکسی نظریہ پر اس کے عمل کی بنیاد ہے، سماج کو سمجھنے اور بدلنے اور اس کی نئی اور بہتر، زیادہ منصفانہ اور زیادہ لطیف اور بارآور ترتیب و تنظیم کرنے کے لئے، اس نظریہ سے زیادہ سائنٹی فک نظریہ، نوعِ انسانی کے پاس، اس عہد میں، اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی

خوبی یہ ہے کہ اس نظریہ کو محض کتابوں کو پڑھکر یا کسی الہامی اور اٹل پیغام یا قول فعل کے ذریعے سکھایا یا سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مارکزم درحقیقت فطرت اور سماج میں حرکت اور تبدیلی، زوال اور ارتقاء کے قانونوں کو سمجھنے اور اس علم کے ذریعہ اور وسیلے سے اپنے فہم و شعور کو جلا دے کر، ایسے عمل کا نام ہے جن کا تقاضہ سماجی زندگی کی ہیئت ایک خاص موقعہ پر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا علم اور ایسا عمل انفرادی اور اجتماعی سعی اور تجربے کے طور پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک طرف وہ نوع انسانی کے تمام سابق مبلغ علم پر عبور حاصل کرنے کا متقاضی ہے، تو دوسری طرف وہ علم و عمل میں جمود کا دشمن ہے بلکہ نئے علوم اور مادّی وسائل و آلات سے زندگی میں مسلسل تجدید اور ثمر بلدی کرتا ہے!

میں دفعتاً یا یک بارگی کسی جذباتی شورش کے ماتحت کمیونسٹ نہیں بنا۔ جب میں اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں پہونچا تب نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک ختم ہو چکی تھی۔ فرقہ دارانہ تناؤ، ہندو مسلم جھگڑے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریک ایک طرف اور مسلمانوں میں تنظیم کی تحریک دوسری طرف اٹھ کھڑی ہوئی تھی، انگریزی حکومت اور اس کے ٹوڈی خوش تھے۔ تمام محبّ وطن مغموم اور مضمحل! ہندو مسلم سمجھوتے کی بار بار کوشش ہوتی لیکن دونوں طرف کے فرقہ پرست عناصر ہر اتحاد کانفرس کو ناکامیاب کرا دینے میں کامیاب ہو جاتے۔ ایک بار لکھنؤ میں بھی ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ میرے کالج کے عزیز ترین دوست ہندو تھے۔

مجھے فسادکے دنوں میں اتنی روحانی اذیت ہوئی کہ میں بیمار پڑ گیا۔
اسی زمانے میں یوپی بنگال اور پنجاب کے نوجوانوں میں ایک نئی انقلابی لہر اٹھی۔ کلکتہ میں جتن داس نے ایک انگریز کو گولی سے مار دیا اور جب اسے پھانسی کی سزا ہوئی تو اس نے خندہ پیشانی سے اپنے بیان میں کہا "میری دعا ہے کہ میرے خون کا ایک ایک قطرہ میرے ہم وطنوں کے دلوں میں آزادی کا بیج بن کر اُگے" —— اس عظیم قربانی کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ اسی طرح ہمارے اپنے ہی صوبے میں لکھنؤ کے پاس رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ وغیرہ کے گروہ نے ایک ٹرین پر حملہ کیا۔ اور سرکاری خزانہ لوٹا۔ بعد کو وہ لوگ گرفتار ہوئے اور ان کو پھانسیاں ہوئیں۔ کانگریسی لیڈروں کے آفیشل بیان' ان نوجوان انقلابیوں کی "تشدد آمیز" کارروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے نکلتے تھے۔ لیکن میں اور میری طرح کے تمام نوجوان ہندوستانیوں اور خود بہت سے کانگریسیوں کے دل میں ان کے لئے عزت کا جذبہ تھا۔ اور ہم سب اس پر فخر محسوس کرتے تھے کہ کم از کم چند ہندوستانی نوجوان تو ایسے ہیں جو سامراجی ظلم و تشدد سے دبتے نہیں اور بیرونی حاکمیت کا خاتمہ کرنے کے لئے جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اب میں رفتہ رفتہ اس خیال کا قائل ہو گیا کہ بغیر انقلاب کے ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی۔ کچھ مبہم طریقے سے یہ خیال بھی سامنے آنے لگا کہ ہمیں بھی اپنے ملک میں روس کی طرح مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ سوویت روس کے متعلق جو خبریں ہمارے اخباروں میں چھپتی تھیں ان میں عام طور پر

بالشویکوں اور بالشویک حکومت کی برائی کا پہلو نکلتا تھا۔ کوئی کمیونسٹ پارٹی یا منظم مارکسی گروپ اس وقت ہمارے ملک میں نہیں تھا۔ جو مارکسی خیالات اور نظریوں کو ہم تک پہنچاتا۔ پھر بھی اس زمانے کے نوجوان طالب علم روسی انقلاب اور کمیونزم میں، بغیر اس کے متعلق صحیح واقفیت حاصل کئے ہوئے بھی گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔ ہمارے لئے یہ کافی تھا کہ بالشویک، برطانوی سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ سامراجی پروپاگینڈے کی کمیونزم کے خلاف شدت ہی ہمارے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتی تھی کہ ضرور کمیونزم کوئی اچھی چیز ہوگی۔ جبھی تو انگریز سامراجی اور ان کے پٹھو ہندوستان کے ٹوڈی اتنی شدت سے اس کی برائی کرتے ہیں!

اسی زمانے میں (غالباً سنہ ۱۹۲۴ء) کانپور میں بالشویک سازش کیس شروع ہوا۔ اس میں مظفر احمد، ڈانگے، گھاٹے اور شوکت عثمان ماخوذ تھے۔ انگریزی حکومت کا مقصد تو یہ تھا کہ اس مقدمے کو چلا کر کمیونسٹ تحریک کا شروع سے ہی سر کچل دیا جائے۔ لیکن یہ مقدمہ کافی دنوں تک چلا۔ ہر روز صبح کو اس کی روداد "پائنیر" اخبار میں (جو خالص اینگلو انڈین سرکاری اخبار تھا) میں چھپتی، میں اس کا ایک ایک لفظ بڑے انہماک سے پڑھتا اور پھر اس کے تراشے بناتا۔ اس طرح گویا میری اور میری طرح کے بہت سے نوجوانوں کی کمیونسٹ تحریک کے متعلق ابتدائی تعلیم ہوئی۔ یہ بہت ناقص اور ناکافی تھی لیکن اس میں "ابتدائے عشق" والی سرشاری کی کیفیت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہمیں آزادی کے دروازے کی کنجی مل گئی ہے۔ ہم کو اس کا احساس نہیں تھا کہ یہ تو روشنی کی صرف ایک

ہلکی سی کرن ہے۔ اور دماغ کے ابھی کتنے گوشے ہیں جن میں گھُپ اندھیرا ہے!
اب مجھے روسی انقلاب اور اس کے متعلق خبروں سے بڑی دلچسپی ہو گئی۔ اس زمانہ میں کلکتہ سے "ماڈرن ریویو" شائع ہوتا تھا، میں اس کا خریدار بن گیا اور بڑی دلچسپی سے اُسے پڑھتا۔ میرے خیال میں وہ واحد انگریزی رسالہ تھا جس میں وقتاً فوقتاً روس کی نئی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت اور اس کے کارناموں سے متعلق مضامین اور نوٹ شائع ہوتے تھے۔ یہ اگر ہمدردی سے نہیں تو مخالفت کی نظر سے بھی نہیں لکھے جاتے تھے۔ اور پھر یہ بھی عجیب بات تھی کہ ہندوستانی نوجوان عام طور پر اُن باتوں اور خبروں پر جو سوشلسٹ حکومت کے خلاف ہوتی تھیں، یقین نہیں کرتے تھے۔ امپیریالسٹ اور رجعت پرست پروپاگینڈے کا ہمارے اوپر اُلٹا اثر ہوتا تھا۔ ہم مبہم طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ روسی انقلاب کے نتیجہ کے طور پر ایک ایسی قوت وجود میں آگئی ہے جو اول تو ہمارے دشمن، برطانوی سامراج کی دشمن ہے، دوسرے یہ کہ ہندوستان اور تمام محکوم قوموں کی آزادی کی طرفدار ہے اور تیسرے یہ کہ اِس میں طاقت جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ محنت کشوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی یہی خصوصیتیں ہمیں اس کا دوست اور طرفدار بناتی تھیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ نان کوآپریشن کی تحریک کی ناکامیابی نے ہمیں یہ بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے دوسرے اور زیادہ کامیاب طریقے دریافت کرنا ضروری ہیں۔
سنہ ۱۹۲۴ء میں میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے میں داخل ہوا۔ میں نے یورپ کی تاریخ، پولیٹیکل سائنس اور اکنامکس کا کورس اپنے لئے

پڑھا لیکن یا تو میرے بیشتر استاد اچھے نہیں تھے یا مجھے خود کورس کی تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی، میں کوئی خاص اچھا یا محنتی طالب علم نہیں تھا۔ میرے استادوں میں سے صرف ایک تھے جن کے لیکچر اور لیکچر سے بھی زیادہ جن کی باتیں مجھے پسند تھیں اور مجھے متاثر کرتی تھیں۔ یہ میرے اکنامکس کے پروفیسر دھرجتی پرشاد مکرجی تھے۔ جنہیں ہم "ڈی پی" کہتے۔ اُس زمانہ میں کارل مارکس کا نام بھی لینا خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ڈی پی نے ایک دن کلاس میں کہا کہ آج کل بہت سے اکنامسٹ مارکس کے نظریوں کو غلط بتاتے ہیں لیکن تم لوگ ان کی باتوں میں مت آنا۔ مارکس کے نظریے ہی دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ اور ان کے اثرات سے دنیا بدل رہی ہے۔ مارکس کو غلط ثابت کرنیوالوں کو دُنیا بھلاتی جاتی ہے۔" ڈی پی صاحب ہندوستانی موسیقی، ہندوستانی مصوّری، ادب، فلسفہ، سیاست، ہر چیز کے بارے میں بات کرتے اور ہمارے نوجوان ذہنوں میں علم، جستجو، تحقیق اور کتب بینی کا بے پناہ شوق پیدا کرتے! آج بھی وہ (۱۹۵۸ء) علی گڑھ یونیورسٹی میں اکنامکس کے پروفیسر ہیں اور جب بھی میں علی گڑھ جاتا ہوں تو اُن سے گھنٹے دو گھنٹے گفتگو کرنے کے بعد دماغ میں ایک تازگی محسوس کرتا ہوں۔ میرے نزدیک ڈی پی ہندوستان کے موجودہ دانشوروں میں بہت اونچی جگہ رکھتے ہیں اور ان کی شاگردی کو میں اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں طالب علمی کے دنوں میں مَیں کورس کی کتابیں کم اور دوسری کتابیں زیادہ پڑھا کرتا تھا۔ یہ میری نظر میں زیادہ دلچسپ تھیں۔

چنانچہ اسی زمانے میں میں نے ٹالسٹائی، تورگنیف، اناطول فرانس
بالزاک وغیرہ کے ناول پڑھے۔ ایک کتاب جس کا میرے اوپر بہت اثر ہوا
اور جسے میں نے بعد کو خرید کر کئی بار پڑھا، برٹرنڈ رسل کی "روڈس ٹو فریڈم"
(آزادی کی راہیں) تھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے کیپٹلزم، سوشلزم،
انارکزم وغیرہ کے بارے میں کسی قدر ٹھوس واقفیت ہوئی۔ رسل کی تحریریں
مجھے پسند آنے لگیں اور اب میں نے اُن کی دوسری کتابیں بھی پڑھیں۔ اِن
میں سے "وہائی آئی ایم نوٹ اے کرسچین" (میں عیسائی کیوں نہیں ہوں)
مجھے بہت اچھی لگی۔ رسل کی کتابوں اور اناطول فرانس کے ناولوں میں مذہبی
عقیدہ پرستی خاص طور پر عیسائی مذہبی عقائد پر عقل پسندی (ریشنلزم) اور
سائنس کی بنا پر سخت فلسفیانہ اور اخلاقی اعتراضات کئے گئے تھے۔ اس کا میرے
اوپر بہت گہرا اثر ہوا۔ رسل اور اناطول فرانس کے بیشتر اعتراضات ہندوستانی
مذہبی عقائد پر بھی صادق آتے تھے۔ اُدھر ہمارے ملک میں مذہب کا جو عملی
مظاہرہ ہو رہا تھا وہ پسندیدہ تو نہیں تھا۔ مذہب کے نام لیوا ایک طرف انسانیت
کشی کے لئے تو دوسری طرف ظلم اور استبداد اور بیرونی سامراج کی سپر کی
طرح سے اسے استعمال کر رہے تھے۔ ان سب باتوں کا میرے بھی دل و
دماغ پر اثر پڑا۔ اور یہ خیال حاوی ہونے لگا کہ مذہب اپنی موجودہ شکل
میں نوعِ انسانی کے لئے رحمت نہیں بلکہ ایک لعنت ہے۔ ایسے عقیدے جو
دلوں میں گداز، نرمی، محبت اور مودت پیدا کرنے کے بجائے انسانوں اور انسانوں
کے درمیان نفرت اور دشمنی پیدا کریں، ایسے عقیدے جو انسانوں کو عقل

کی روشنی، تجربے، تجدید، اور ارتقا سے دور کریں بلکہ اِن کی راہ میں رکاوٹ بنیں، اور جن کو رجعت پرست، انسانوں پر ظلم اور تعدی کرنے والے اور انہیں غلام بنانیوالے، اپنے دنی اور پست مقاصد کے لئے ہر موقعہ پر استعمال کر سکیں کیا اُن میں کوئی بنیادی کھوٹ نہیں ہے ؟ اس زمانہ میں میرا خود کوئی مثبت عقیدہ یا فلسفیانہ تصور جو مکمل اور قابل اطمینان ہو، نہیں تھا۔ تحقیق اور تفتیش نے جیسے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ میں یوں محسوس کرتا تھا کہ جیسے کسی بہت اونچی، پُر فضا لیکن سُنسان پہاڑ کی چوٹی پر اکیلا کھڑا ہوں، چاروں طرف، اوپر نیچے، داہنے بائیں، دِل کو کھینچنے والے مناظر ہیں، روح ایک تازگی اور تابندگی محسوس کر رہی ہے۔ کبھی آسمان کی چمکتی ہوئی نیلاہٹ سے آنکھیں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا، تو کبھی نقرئی جھاگ اڑاتے ہوئے آبشاروں کی موسیقی اپنا طلسمی جال پھیلا دیتی ہے، کبھی پائین کے سیدھے اور لمبے قدآور درختوں کے جنگل سے ہوا سنسناتی ہوئی گذرتی ہے اور اسکی سوکھی پتیوں کی سوندھی مہک، جسم و جان کو ایک اڑتے ہوئے عطر سے نہلا کر پاک اور منزہ کر دیتی ہے لیکن افسوس کہ ان مصفا اور بے لوث ٹھنڈی بلندیوں پر ہم ہمیشہ قیام نہیں کر سکتے۔ وہ دریا جو انسانی بستیوں کو سیراب کرتے ہیں، چٹیل اور گرم اور مرطوب میدانوں میں بہتے ہیں، وہاں زندگی کے بیچ دھول مٹی، کیچڑ اور پانی میں مِل کر لہلہاتے کھیت بن کر اُگتے ہیں۔ اور وہیں انسانوں کا خون پسینہ، ان کی محنت کا جوہر لطیف، ان سب پر عملدرآمد کر کے، تمام اُن روحانی اقدار اور مادی سامانِ معیشت، علوم اور اخلاق اور

تمام اُن وسائل اور اسباب، اسلحے، اوزار اور زیورات کی تخلیق کرتا ہے جن سے زندگی کی تکمیل و تزئین ہوتی ہے!

لیکن اب مجھے یہ داستان ختم کرنی چاہیئے۔ اپنے بارے میں باتیں کرتے رہنا نازیبا ہے۔ اگر آپ کو یہ کہانی تھوڑی بہت بھی دلچسپ معلوم ہوئی ہے تو اسے ایک مختصر افسانہ سمجھ کر پڑھیئے اور مجھے معاف کر دیجئے۔ زیادہ کہنا سمع خراشی ہو گی اور میں خودستائی کے الزام سے بچ نہ سکوں گا۔

کرشن چندر

میرا بچپن چونکہ کشمیر میں گذرا ہے۔ اور زیادہ تر فطرت کی آغوش میں گذرا ہے۔ اس لئے زندگی کی سب سے بڑی شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا ہے وہ فطرت ہے۔ سردیوں میں برف کے گرنے سے بہاروں میں پھولوں کے کھلنے تک میں نے فطرت کی گوناگوں کیفیتوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کی دحشت اور سرکشی میں بھی میں نے ایک قسم کا نظم ایک قسم کی جمالیاتی شان دیکھی ہے۔ جو میں نے اور کہیں نہیں پائی۔ میں سب سے زیادہ خوشی فطرت کے ساتھ رہنے میں محسوس کرتا ہوں۔ شہروں سے مانوس ہونے پر بھی میں شہروں سے نامانوس ہوں۔ اور بالعموم شہر سے باہر

رہنے کی کوئی جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔ جہاں کھیت اور درخت، پہاڑ اور سمندر میرے سامنے رہیں۔ میری زندگی کے علاوہ میرے ادب میں جو احساسِ جمال کسی کو ملتا ہے، اُس کا منبع یہی فطرت ہے۔ واقعیت اور حقیقت نگاری کا پہلا درس بھی مجھے ایک طرح سے فطرت ہی نے دیا۔ کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی تہی دستی، مجبوری، بے چارگی اور غربت کا تضاد اِس قدر واضح اور شدید تھا کہ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کا سلسلہ جو چلا تو پھر بہت دُور تک پہنچا۔ اور بھی آگے کہاں جائیگا، یہ میں آج نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا ضرور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی میں گورکی بہت بعد میں آیا۔ پہلے تو فطرت ہی آئی! اور پہلے تو صرف اُس کے حسن نے اس کے سطحی حُسن نے مجھے متاثر کیا بعد جب غور کرنے کی عادت جڑ پکڑنے لگی تو میں نے دیکھا کہ فطرت کے حُسن کے اندر بھی، پنکھڑیوں کی شوخ رنگی، بُلبل کی نغمہ سرائی اور جھرنوں کی چھنک کے اندر بھی ایک مربوط منظم مقصد کارفرما ہے۔ اس سے پہلی بار مجھے یہ خیال آیا کہ اگر فطرت بے مقصد نہیں ہے تو انسان بھی بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اُس کی زندگی۔ اُس کا سماج، اُس کا ادب بھی بے مقصد نہیں ہو سکتے!

ظاہر ہے فطرت میں تخلیق ہے تو تخریب بھی ہے، وحشت ہے تو سکون بھی ہے۔ جہد مسلسل کے ساتھ مفاہمت بھی رواں دواں ہے۔ لیکن ان تمام مختلف عناصر کو نظامِ فطرت نے ایک ایسے توازن سے باندھا ہے۔

ہے جسے دراصل خوبصورتی سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اسی توازن کو میں حُسن کہتا ہوں۔ اور جب میں اِنسانی سماج میں حُسن لانے کو کہتا ہوں تو میرے ذہن میں سطحی حُسن کے بعد جو حُسن کی دوسری تصویر آئی تھی وہ اس فطری توازن کے حُسن کی تھی جسے میں انسانی زندگی میں جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہوں۔ گویا میری زندگی کے یہ سوچنے سمجھنے، میرے ادراک اور فلسفے کے پہلے اُصول فطرت نے مرتب کئے ہیں۔

فطرت کے بعد سائنس آتی ہے۔ اسکول میں پڑھائی جانے والی ابتدائی سائنس نے، آپ اسے شخصیت کہہ لیجئے یا واقعہ، مجھے بے حد متاثر کیا۔ اِس کا طریقہ استدلال اور استخراج مجھے آج بھی ہے، جو اشیاء کو اجزاء میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور پھر ان اجزاء کو ایک مرکب میں باندھ دیتا ہے اور اس طرح تخلیق اور تخریب کے اصولوں کو سمجھنے کی عقلی کوشش کرتا ہے۔ کسی شے کی آخری ماہیت شاید سائنس بھی معلوم نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ اس دروازے تک تو پہنچ سکتی ہے، جسے حرفِ آخر کہنا چاہیئے اور جس کی چابی سائنس کے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن سائنس میں یہ تو خوبی ہے کہ وہ کسی حرفِ آخر کو آخر نہیں سمجھتی۔ مذہب کی طرح! ——— ایک ایٹم کو توڑنے سے لاکھوں نئی دُنیائیں آباد ہوتی ہیں اور برباد ہوتی ہیں۔ اور سائنس کو اپنی تگ و دَو کے لئے نیا میدان مِل جاتا ہے۔ لیکن مذہب اور ہر مذہب اپنی قطعیت میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اور مذہب کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ سائنس نے مجھے مذہبی ہونے سے بچا لیا۔ اور اس

حد تک بچایا کہ آج میں بھی سائنس کے کئی اصولوں اور کئی دریافتوں کو شبے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں آج تو تم کہتے ہو یہ سچ ہے۔ کل کو خدا جانے کیا سچ ہو؟

سائنس نے میرے بہت سے اوہام دور کئے۔ ذہن کے بہت سے پرانے جالوں کو صاف کیا اور شکوک کے کئی نئے جالے دیئے (ایسا بھی ہوتا ہے!) لیکن سائنس میری زندگی میں اس لئے اہم ہے کہ اس نے میری فطرت پسندی کو ایک نئی شکل دی۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں انسانی سماج کی صعوبتوں کو دور کرنے کا اگر کوئی منصوبہ تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ انسان کو فطرت کے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ سادہ زندگی اختیار کرنی چاہئے۔ شہری چالاکی سے بچنا چاہیئے۔ زیادہ مشینیں انسان کے لئے مفید نہیں ہیں یعنی ٹالسٹائی یا گاندھی! مگر بہت جلد یہ خیال دور ہو گیا اور سائنس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ فطرت کے راز معلوم کر کے ہم انسانی سماج میں فطرت کا سا توازن لاتے ہوئے فطرت سے کہیں بہتر نظام زندگی مرتب کر سکتے ہیں۔ یعنی انسان اپنی عقل و دانش سے فطرت پر اضافہ کر سکتا ہے۔ سادہ زندگی کی بجائے بھرپور اور پیچیدہ زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ شہر اس طرح وسیع اور کھلے آباد کئے جا سکتے ہیں کہ ہر گام پر فطرت کا شبہ ہو۔ اور یہ سب کام مشینوں کے بغیر ممکن نہیں۔

فطرت اور سائنس کے بعد میری زندگی کا تیسرا موڑ اور سب سے اہم موڑ اشتراکیت کی آمد ہے۔ وہ خیال جو روسی انقلاب کے بعد اک دھماکے

کی طرح ساری دُنیا میں پھیلا۔ اور ساری دُنیا کے نوجوان اذہان نے اس کی گونج سُنی۔ کالج کے پہلے سال ہی میں جہاں میں نے سائنس کے مضامین لئے وہاں میں نے مارکس، لینن اور اینگلز کی تعلیمات کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک طرف دہشت پسندوں سے رابطہ قائم کیا۔ تو دوسری طرف سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے علمی اور سیاسی مجلسوں میں شریک ہونے لگا۔ وطن کی آزادی میرے سامنے صرف ایک ملک کی آزادی کی شکل میں نہ آئی بلکہ اُسے میں نے ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکہ بلکہ خود یورپ کے بیشتر حصوں کے کروڑوں عوام کی آزادی کی تحریک کی صورت میں دیکھا، جو ایک مخصوص نظام زندگی کے چنگل سے نکل کر ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی آزادی کا تصوّر کانگرس کے پاس نہ تھا۔ مسلم لیگ کے پاس نہ تھا۔ مہاسبھا اور اکالی دَل کے پاس نہ تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان جماعتوں کی اہمیت سے ناواقف تھا یا ان کے پیچھے کارفرما تاریخی قوتوں کے وجود سے منکر تھا۔ لیکن میرے لئے ان کی دلچسپی محدود تھی۔ میں انہیں عوام کے نمائندے ان معنوں میں نہ سمجھتا تھا۔ جن معنوں میں اکثر لوگ سمجھتے تھے۔ یعنی یہ ایسے لوگ ہونگے، یہ ایسی جماعتیں ہونگی جو ملکوں اور قوموں کو سامراجی نظام زندگی سے آزاد کرا کے ایک نئے نظام زندگی کی بنیاد ڈالینگی۔ میں نے ان جماعتوں کی محدود افادیت کو سمجھکر بھی کبھی انہیں اپنا راہنما یا راہبر نہ جانا، ان سے زیادہ توقع نہ رکھی۔ لیکن اگر کبھی ان سے کوئی حسین کام ہو بھی گیا تو میں حیرت میں رہ گیا۔ آئیں! ان لوگوں

نے تو اس حسن سلوک کی امید نہ تھی۔ یہ کیسے ہو گیا! اس بات کا مجھے ہمیشہ یقین رہا کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام تو کرنا ہو گا۔ اور ان کے ساتھ مل کر ہی ملک کو آزاد کرانا ہو گا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی یہ لوگ ہمیں نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ ممکن ہے انگریزوں سے زیادہ بہتر طریقے سے زیادہ سلیقے سے کھائیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرغ کو بوٹی کر کے کھائیں لیکن کھائیں گے ضرور! اس لئے میں گاندھی، جواہر لال، جناح یا گول والکر کی تعلیمات کو اُس رُوحانی تقدس کے ہالے میں نہ دیکھ سکا جس طرح اور بہت سے باشعور لوگوں نے دیکھا اور آج بھی دیکھتے ہیں!

جس طرح کوئی خیال جزو ایمان بن جاتا ہے۔ اسی طرح اشتراکیت نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ میرے بنیادی عقائد کا مرکز بن گئی۔ اور میرے متعلقہ حیات کا سب سے روشن پہلو! لیکن اس کا کیا کیجئے۔ کہ ہر چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے۔ اور ہر روشنی اپنا سایہ ساتھ لاتی ہے۔ میں آج بھی اشتراکیت کے راستے پر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق چلتا ہوں، کام کرتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لیکن میں اس کا اندھا مقلد نہیں ہوں۔ اشتراکیت بیسویں صدی کا مذہب ہے۔ مذہب ان معنوں میں کہ ہر مذہب تاریخ میں اپنا درس حیات، ایک مخصوص نظام زندگی، ایک مخصوص حلقہ اور فکر لے کے آتا ہے۔ اور اُس کی ترویج اشاعت کرنے میں اور کروڑوں انسانوں کو اپنا ہمنوا بنانے میں کوشاں رہتا ہے۔ اور تاریخ کے اُس موڑ پر انسانیت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

یہ سب باتیں میں اشتراکیت میں دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ سرمایہ داری اپنا کام کر چکی۔ اب اگلے سو سال یا ڈیڑھ سو سال یا دو سو سال تک انسانی سماج کو لامحالہ اپنی بہتری کے لئے اشتراکیت کے راستے پر چلنا ہوگا۔ اِس امر کا ایک بہت واضح تصور میرے ذہن میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اشتراکیت کو اِنسانی ناطے اور نظامِ حیات کا حرفِ آخر سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اس کے اندر روشنیاں ہیں تو سائے بھی ہیں۔ ایک زمانہ ہوتا ہے جب ہر فلسفہ شہیدوں کی تحریک ہوتا ہے۔ اشتراکیت کی تحریک آج دنیا بھر میں شہیدوں کی تحریک سے آگے جا چکی ہے۔ آج دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی سوشلزم میں اپنی راہ نجات دیکھتی ہے۔ اور یہ تعداد بڑھتی ہی جائیگی۔ اب اشتراکیت کی تحریک اُس منزل اور اُس موڑ پر آ گئی ہے کہ خود اس کی بہبودی کے لئے اس کا سختی سے محاسبہ کیا جائے۔ اور جدید سائنسی اِنکشافات کی روشنی میں اور ماضی کے تجربوں کی بنا پر اس پر کڑی سے کڑی تعمیری تنقید کی جائے۔ ورنہ اِس بات کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ جب کوئی تحریک اس حد تک پھیل جائے تو اس میں مذہبیت کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ عناصر جو اس کے بُت بناتے ہیں اور خدا، اس کا مقدس کلام، رسوم اور روایتیں، پجاری اور پیروکار اور اِس طرح سے اِس کے اِرتقا کی رفتار کو کم کرتے ہیں۔ اِس خطرے سے بچنا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکیت مستحکم ہونے پر اگر اس کے روایت پسند خوشامدیوں کی تعداد بڑھے گی تو اس کے اپنے ہی بطن

سے اس کے زیادہ سے زیادہ نقاد بھی پیدا ہونگے۔ اس کی صورت بدلے گی اور وہ بدلتی ہوئی صورت اشتراکیت کے موجودہ اور مروجہ سماجی اداروں کو بھی بدلے گی۔ پھر یہ اشتراکیت اپنی باطنی کیفیت میں بھی بالکل ہی بدل جائے گی۔ اور اس کے بطن سے ایک نیا شگوفہ پھوٹیگا اور انسانی سماج کی ترقی کے لئے ایک نیا فلسفہ وجود میں آئے گا۔ یوں تو ہوگا ہی۔ اور اسے کوئی روک نہ سکے گا۔ خود اشتراکیت بھی اسے روک نہ سکے گی!!

بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر بے حد معمولی معلوم ہوتی ہیں میں نے اپنے والد سے سیکھی ہیں۔ یعنی طے شدہ امور کو غیر طے شدہ سمجھنا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے حظ اٹھانا، اپنے مخالفوں کی عزت کرنا۔ اور ان کی باتوں کو انتہائی غور سے سننا۔ بڑے آدمیوں پر اعتبار نہ کرنا۔ اور عام لوگوں سے میل جول رکھنا۔ اور ان پر زیادہ بھروسہ کرنا۔ میرے والد کو ایک ذہین اور قابل ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے راجاؤں مہاراجاؤں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن وہ ان کی صحبت پر ہمیشہ معمولی آدمیوں کے ساتھ کو ترجیح دیتے تھے۔ اور ان کے ملازم ہوتے ہوئے بھی۔ اپنی نجی گفتگو میں اُن سے شدید نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اور اپنی فرصت کے اوقات باغ کے مالی سے، راہ چلتے ہوئے کبھی نادار راہ گیر سے یا کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے گفتگو کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اپنی چھوٹی سی زندگی میں ہندوستان کے کئی ایک عظیم الشان شخصیتوں

کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اور اکثر میں نے اُن کو نہایت تنگ نظر، خود غرض، مکّار اور جاہ پرست پایا ہے۔ اُن سے زیادہ انسانیت، رواداری اور خلوص میں نے اُن لوگوں میں پایا ہے۔ جو میرے ہمسائے تھے۔ یا میرے لئے مکمّل اجنبی تھے۔ لیکن جو بہت معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ اُن معنوں میں کہ اُن کا آج بھی کہیں کوئی نام نہیں ہے۔ اور وہ کسی قوم یا بین الاقوامی حیثیت کے مالک نہیں ہیں، لیکن جو درحقیقت قوم ہیں۔ اور واقعی جن کے روزمرّہ کے کام سے اور شرافت سے انسانیت کو بقا حاصل ہے! میرے والد بالکل ایک عام آدمی کی سی زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے انسان کو انسان کی طرح رہنا چاہئے۔ فرشتے کی طرح نہیں۔ اس لئے تھوڑا سا گناہ کر لو، تھوڑی سی غلط کاری بھی بری نہیں، تھوڑی سی بے راہ روی بھی جائز ہے۔ بظاہر یہ بات کس قدر غلط معلوم ہوتی ہے، لیکن زندگی کے تجربوں نے اس کی صداقت بھی عیاں کر دی۔

پہلی ادبی کتاب جو میں نے پڑھی وہ الف لیلہ کا اردو ترجمہ تھا یہ تیسری جماعت کا قصہ ہے۔ والد ادبی کتابیں پڑھنے سے منع نہیں کرتے تھے۔ لیکن والدہ کو سخت اعتراض تھا۔ الف لیلہ کے بعد میں نے سدرشن کی کہانیاں پڑھیں، پھر پریم چند کی کہانیاں۔ میٹرک تک میں نے بہت سا اُردو ادب کھنگال ڈالا۔ میٹرک میں ٹیگور انگریزی میں پڑھا۔ اس کا اثر بہت دیر تک دل و دماغ پر رہا۔ انقلابِ روس

سے پہلے کے بڑے بڑے روسی ادیبوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پشکن، گوگول، لیرمنتوف، آندریف، تورگنیف، چیخوف، ٹالسٹائی، استراوسکی، گورکی تک روسی ادب اتنا اچھا اور تندرست ہے کہ دوسری زبان کے ادب میں اس کی مثال مشکل سے ملیگی۔ پرانے ادیبوں میں جن لوگوں کو بار بار پڑھ سکتا ہوں اور پڑھتا ہوں وہ شیکسپیئر اور غالب ہیں۔ غالب کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ نہ صرف اُردو نے بلکہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان نے بھی ۱۸۵۷ء کے بعد اتنا بڑا شاعر نہیں پیدا کیا۔ لیکن یورپ کا مزاج انہیں کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ موجودہ یورپی ناول نگاروں میں شولوخوف، ارنسٹ ہمنگ وے اور ہاورڈ فاسٹ بہت پسند ہیں۔ اجنتا کی میں تعریف کرتا ہوں لیکن گذشتہ چار سو سال میں یورپی مصوری نے جو سرمایہ انسانی کلچر کو دیا ہے وہ اس قدر عظیم ہے کہ اُس سے متاثر نہ ہونا گناہ کبیرہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں کھجو راہو اور اہورا کے بت کلاسیکی یونانی اطالوی نشاۃ الثانیہ اور ماڈرن یورپی سنگ تراشوں اور صنم گروں کی تخلیقات کے ہم ساتھ ہیں۔ اور کہیں اُن سے بڑھ بھی جاتے ہیں۔ بالعموم نثر میں یورپ کے نثر نگاروں کے کہنے کے ڈھنگ سے متاثر ہوں۔ اور شاعری میں مشرقی شاعروں کی ادا کا قتیل ہوں اور قتیل تو جانے کس کس کا ہوں کیونکہ ہر نیا روز ایک نیا سورج لیکر آتا ہے۔

خواجہ احمد عباس

جن شخصیات نے مجھے متاثر کیا وہ ایک دو نہیں سینکڑوں
ہزاروں بلکہ شاید کروڑوں ہیں۔ کیونکہ انسان کی زندگی اپنے ماں باپ
اور قریبی رشتہ داروں اور دوستوں یا نمایاں سیاسی لیڈروں ہی کا
اثر نہیں قبول کرتی۔ اُس کی زندگی اور اُس کے کردار کی تشکیل میں اس
کے تمام ہم قوم اور ہم عصر بھی حصہ لیتے ہیں۔ جو ماحول ایک انسان کی
تربیت کرتا ہے اس میں وہ جسمانی اور نفسیاتی ورثہ تو شامل ہوتا ہی ہے
جو اُسے اپنے ماں باپ سے ملتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بدلتے ہوئے
سماجی حالات اور سیاسی اور اقتصادی انقلابات بھی اُس ترکے میں

شامل ہیں جو ہر انسان کو ملتا ہے۔ چاہے وہ اُسے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے
انسانی زندگی داخلیت اور خارجیت دونوں کے تانے بانے سے بنتی ہے
اور اس حقیقت سے کوئی نہیں انکار کر سکتا چاہے وہ مارکس کا چیلا ہو
یا فرائڈ کا پیرو ہو۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی بناوٹ میں نفسیات
کا تانا زیادہ اہم ہے یا معاشیات کا بانا۔

اس لئے نہ تو میں اُن تمام شخصیات کے نام گِنا سکتا ہوں
جنہوں نے میرے کردار اور نقطۂ نظر کی تشکیل کی۔ اُن میں سے بہت سوں
سے تو میں صرف لاشعوری طور پر متاثر ہوا ہونگا۔ اور نہ یقین کے ساتھ
ان مختلف اثرات کا مول تول کر سکتا ہوں کہ ان میں سے مقابلتہً کون
زیادہ اہم تھے اور کون کم اہم۔ صرف اپنی یاد کی مدھم روشنی میں چند
شخصیات اور واقعات کی تلاش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری چالیس
سالہ زندگی میں مجھے متاثر کیا اور جن کی نفسیاتی چھاپ میرے شعور اور
میرے کردار پر آج تک موجود ہے۔

سب سے پہلی اور میرے بچپن میں سب سے اہم شخصیت جس
نے مجھے متاثر کیا وہ میرے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم تھے۔ وہ
ہمارے خاندان ہی میں نہیں ہمارے سارے قصبے میں سب سے
نمایاں ہستی تھے۔ میرے بچپن کی اوّلین یادیں ان کی شخصیت سے
وابستہ ہیں۔ گیارہ برس ہوئے لگ بھگ اسّی برس کی عمر میں انہوں
نے وفات پائی لیکن بچپن ہی سے ہم سب بھائی بہن اُن کو بہت بوڑھا

سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر بچاس بچپن برس کی تھی اور ان کی مختصر داڑھی پوری طرح سے سفید نہیں ہوئی تھی اور ان کے گورے چہرے پر جھریوں کا بھی کوئی نشان نہیں تھا لیکن پھر بھی ہمارے ذہن میں انکی شخصیت الف لیلہ کے کسی دراز ریش بزرگ کی سی تھی جو اپنی عقل اور دوراندیشی سے انسانی زندگی کے اُلجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھاتا ہے، اور خواجہ خضر کی طرح ظلمات کے اندھیرے میں سندباد جہازی کو راستہ بتاتا ہے۔ دراصل ہم بچپن میں خدا کی ہستی کو بھی اپنے نانا کی نورانی صورت اور بزرگانہ شان ہی میں تصور کرتے تھے۔ سنا تھا کہ خدا ساری کائنات میں بزرگ و برتر ہے۔ سو ہمارے نانا (جنہیں ہم بابا کہا کرتے تھے) بھی ہمارے قصبے کی سب سے بزرگ اور قابل احترام ہستی تھے جن کا حکم ہر کوئی مانتا تھا۔ سنا تھا کہ خدا نیکی سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور بدی سے ناراض ہو کر سزا دیتا ہے۔ بس یہی خصوصیت ہمارے بابا کی تھی۔ وقت پر نماز پڑھنے اور قرآن کا سبق یاد کرنے پر ہمیں ان کے دربار سے دو پیسے ملتے تھے۔ (اور اُس زمانے میں دو پیسے کتنی بڑی دولت ہوتے تھے اس کا تو آج اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا) اور جھوٹ بولنے یا گالی بکنے پر اُن کے ہاتھ سے ہمارے گالوں پر دو زناٹے دار چپت پڑتے تھے۔ جزا اور سزا کا مسئلہ ہمارے لئے بالکل بھی مبہم اور پیچیدار نہیں تھا۔

جب میں چار یا پانچ برس کی عمر میں گھر کی چار دیواری سے اسکول کی دنیا میں آیا اُس وقت مجھ پر اپنے بابا کی شخصیت کے دوسرے اہم پہلو روشن ہوئے۔ یہ اسکول ہمارے پڑنانا خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے نام پر

حالی مسلم ہائی اسکول کہلاتا تھا اور خواجہ سجاد حسین اس کے بانی، سکریٹری اور کرتا دھرتا تھے۔ در اصل ان کی زندگی تمام تر اس اسکول کے لئے وقف تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اپنے ہم قوموں میں نئی تعلیم رائج کرنے کے لئے انہوں کتنی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے پڑھے ہوئے پہلے چار مسلمان نوجوانوں میں تھے جنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بی۔ اے کی سند دولت اور اقتدار کی سنہری کنجی سمجھی جاتی تھی۔ یوپی کے گورنر نے چار مسلمان نوجوانوں کو بلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی اعلیٰ عہدے کے لئے بھی وہ درخواست دے سکتے ہیں۔ انہیں صرف یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کس محکمے میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ سول سروس۔ فوج۔ پولیس۔ جوڈیشری یا تعلیم۔ ایک نے سول سروس کو چنا اور دس برس میں کمشنر کے درجے تک پہنچ گیا جو اس زمانے میں ہندوستانی سویلین کی معراج تھی۔ دوسرے نے پولیس کا محکمہ چنا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی۔ تیسرا جوڈیشری میں گیا اور سشن جج ہو کر ریٹائر ہوا۔ لیکن سجاد حسین نے وہ محکمہ پسند کیا جو سرکاری ملازمتوں میں اُن دنوں سب سے گھٹیا سمجھا جاتا تھا۔ یعنی تعلیم۔ ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر ہوئے اور انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل مقرر ہی ہوئے تھے کہ نوکری سے استعفٰے دیکر چوتھائی تنخواہ پر پنشن لے لی اور جائداد بیچکر اُس کے روپے سے اپنے قصبے میں اسکول چلانے لگے۔ اور اس کے بعد نہ صرف اپنی ساری پنشن بلکہ اپنی ساری باقی عمر اور اپنا تمام وقت اور تمام ہمت

اور محنت اس اسکول کے چلانے، بڑھانے اور ترقی دینے میں صرف کر دی۔ ۱۹۴۲ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو میں اُن کے بستر مرگ کے قریب ہی تھا۔ موت سے صرف ایک گھنٹہ پہلے انہوں نے انتہائی کمزوری اور بے ہوشی کے عالم میں ایک لمحے کے لئے آنکھ کھولی اور ہونٹوں کی خفیف سی جنبش سے پوچھا "میٹرک کا نتیجہ کب نکلے گا؟" آخری دم میں بھی ان کو اسکول ہی کی فکر تھی۔

اپنے نانا کے بعد جس ہستی سے میں اثر پذیر ہوا وہ میرے والد خواجہ غلام السبطین کی تھی۔ اگر بابا کی زندگی ایثار اور خدمت قومی کا ایک روشن نمونہ تھی تو ابا (جیسا ہم اپنے والد کو کہتے تھے) کے کردار سے میں نے بچپن ہی میں انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے اُن اصولوں کو سمجھا اور سیکھا جو آخر مجھے اشتراکیت کی سرحد تک لے آئے۔ جس خاندان اور جس ماحول میں میں پیدا ہوا تھا اُس میں چھوٹی موٹی زمینداری کی بنیادوں پر کتنی ہی جھوٹی قدروں کے کھنڈر ڈگمگا رہے تھے۔ حسب نسب۔ شرافت رذالت۔ اونچے خاندان۔ نیچ خاندان۔ سید، انصاری، شیخ، مغل اور پٹھان کے امتیازات۔ شادی بیاہ کی رسوم میں فضول خرچیاں۔ قبر پرستی۔ توہم پرستی، تعویذ گنڈے۔ پیری مریدی۔ نذر نیاز۔ عرس اور قوالیاں۔ مجلسیں اور ماتم، اگر میں شروع ہی سے ان اقدار کے غلط اثرات سے محروم یا محفوظ رہا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ میرے والد ایک ایسے اسلام کے پیرو تھے جس میں توہمات اور تعصبات دونوں کے لئے جگہ نہیں تھی اور جس کی بنیاد

عقل اور انسان دوستی پر تھی۔ پانچ برس کی عمر میں میں نے جمہوریت کا نام بھی نہیں سنا تھا نہ انسانی برابری کا مسئلہ کسی نے مجھے سمجھایا تھا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک بار گھر کے ملازم چھوکرے کو (جو میرا ہی ہم عمر تھا) "اُلّو کا پٹھا" کہنے کی یہ سزا ملی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی۔ جب تک ہاتھ جوڑ کر اُس ملازم سے معافی نہیں مانگی ابّا کٹّر حد تک سادگی پسند (Puritan) تھے۔ نہ انہیں انگریزی فیشن اچھے لگتے تھے اور نہ وہ ہندوستانی ٹیپ ٹاپ کو ہی پسند کرتے تھے۔ نہ وہ اپنی بیٹیوں کو زیور گہنے بنوا کر دیتے تھے۔ نہ بیٹے کو انگریزی لمبے بال رکھنے دیتے تھے۔ عرس میں جا کر قوّالی سننے کو بھی برا سمجھتے تھے۔ اور سینما کے ناچ گانوں کو بھی۔ نہ ہمیں پان کھانے کی اجازت تھی نہ چائے پینے کی۔ اُن کی خواہش اور اور کوشش تھی کہ اُن کی اولاد سادہ اور جفاکش زندگی کی عادی ہو، توہمات اور غیر ضروری رسومات سے آزاد ہو۔ اور تعلیم اور صحت کی طرف پوری توجہ دے۔ اپنے عقیدے میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ مگر ان کے مزاج میں ایک عجیب شگفتگی اور مزاح کی چاشنی تھی جو ان کی اصول پرستی کو کٹھ مُلّاؤں کی سی روکھی پند و نصیحت سے بچائے رکھتی تھی۔ کسی کو پان سے ہونٹ رچائے ہوئے دیکھتے تو سنجیدہ چہرہ بنا کر پوچھتے "خیریت تو ہے؟ کیا چوٹ لگ گئی ہے کہ منہ سے خون جاری ہے؟"۔ چائے کو بھنگ کہتے تھے۔ لیکن کوئی چائے کا شوقین دوست ملنے آ جاتا تو کہتے "ارے اندر جا کر کہو ایک بھنگڑ آیا ہے اس کے لئے تھوڑی سی بھنگ گھول کر بھیج دیں۔"

ابا جتنے اپنے عقیدوں میں پکے تھے اتنی ہی حد تک آزادیٔ رائے کے حامی بھی تھے۔ آخر عمر میں وہ مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے (جو مسلم لیگ کی طرح فرقہ وارانہ جماعت تھی) اور میں اس وقت تک کانگریس کو بھی پیچھے چھوڑ کر سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن کبھی انہوں نے اپنے اصول مجھ پر زبردستی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سیاسی بحث ضرور کرتے۔ گرما گرمی بھی کبھی کبھی ہو جاتی۔ لیکن جیسی برابر کے دوستوں میں ہوتی ہے۔ ان کے کئی دوستوں نے بار بار انہیں سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو انقلابی تحریکوں کا ساتھ دینے سے روکیں لیکن ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کانگریس یا سوشلسٹ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دو۔ دراصل وہ دل ہی دل میں اس بات سے بہت خوش تھے کہ ان کا بیٹا اپنے اصولوں پر اٹل رہنے کی ہمت رکھتا ہے (خواہ اُن اصولوں کو وہ کتنا ہی غلط سمجھتے ہوں)۔

ماں باپ اپنی اولاد کے لئے نقد، مکان، جائداد، زمین ورثے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ابا نے ان میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑا مرنے سے چند روز پہلے مجھے ایک فہرست دی اُن رشتے داروں، دوستوں اور جاننے والوں کی جن کو انہوں نے مختلف رقمیں قرض دی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا کوئی ہنڈیاں، پرچے یا رسیدیں ہیں کیا۔ جواب میں انہوں نے سر ہلا کر نہیں کہہ دیا۔ پھر مجھے ہدایت کی کہ ان میں سے کسی پر کبھی ادائگی کا تقاضہ نہ کرنا۔ ان لوگوں کے پاس ہوگا تو وہ خود واپس کر دیں گے۔ ساری رقمیں ملا کر بتیس ہزار کے لگ بھگ تھیں۔ ایک ہزار روپے بھی واپس نہیں ملے۔ ان میں سے زیادہ تر

لوگ اب پاکستان چلے گئے ہیں اور مدت ہوئی میں نے وہ فہرست بھی پھاڑ دی ہے۔ ابا جو "جائداد" ہمارے لئے چھوڑ گئے وہ دوسری ہی قسم کی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ بظاہر اُن میں اور مجھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں نظر آتی۔ ان کے چہرے پر ڈاڑھی تھی، میں روز شیو کرتا ہوں۔ وہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ میں قمیض اور پتلون پہنتا ہوں۔ وہ مسلم کانفرنس کی فرقہ وارانہ سیاست کو سراہتے تھے۔ میں کانگریس کے دائیں بازو کو بھی رجعت پسند قرار دیتا ہوں اور کوشاں ہوں کہ ہمارا ملک جتنی جلدی ہو سوشلزم کی منزل تک پہنچ جائے۔ وہ کبھی فلم نہیں دیکھتے تھے۔ میں فلم بناتا ہوں۔ وہ عورتوں کو پردہ کرانے کے حامی تھے اور میں اس کا مخالف ہوں۔ ان تمام باتوں کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ ان کو میری شخصیت اور میرے کردار میں میرے والد کی جھلک نظر آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے میں بھی ان کی طرح ضدّی ہوں، کوئی کہتا ہے وہ بھی میری طرح "غیر مقلد" (Non-Conformist) تھے۔ کسی کی رائے ہے کہ میں بھی ان کی طرح روپے پیسے کی طرف سے لاپرواہ ہوں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں خودسر اور خود رائے ہیں۔ اور شائد وہ غلط نہیں کہتے۔ میرے عقائد اور خیالات میری نسل اور میرے زمانے کی پیداوار ہیں۔ لیکن جن اثرات نے میرے بنیادی کردار کی تشکیل کی ہے ان میں (ہر معمولی انسان کی طرح) میرے والد اور والدہ کی شخصیات اور سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہیں۔

میرے ابا اور میری اماں کے کرداروں کا تضاد نہ صرف دلچسپ بلکہ معنی خیز تھا۔ جن چیزوں کو ابا ناپسند کرتے تھے (جیسے پان، چائے، سرمہ،

کاجل، مسّی، چوڑیاں، زیور، بچوں کے لئے ریشمی کپڑے) ان سب کو، اماں پسند کرتی تھیں۔ ابا کا اصرار تھا کہ اُن کے بچے کھدر کے سادہ کپڑے پہنیں۔ مگر اماں آنکھ بچا کر ہمیں ململ کے کُرتے، لٹھے کے پاجامے اور عید پر ریشمی شیروانیاں بنوا کر دیتی تھیں۔ ابا کبھی ہمیں ڈانتے تو وہ ہمیں پچکار کر تسلی دیتیں۔ ایک طرف سے سختی اور دوسری طرف سے نرمی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم بچوں کی زندگی میں آپ سے آپ ایک قسم کا توازن آ گیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے یہ پروگرام بنایا تھا۔

یہ تو ہمیں بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ہماری اماں بھی (ہر ماں کی طرح) اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم اس کا جائز اور ناجائز فائدہ بھی اٹھایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی کے صرف آخری دنوں میں مجھے اپنی اماں کے کیرکٹر کی مضبوطی، ان کی انسان دوستی اور رواداری کا پورا احساس ہوا۔

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اس وقت (والد کا انتقال ہو چکا تھا) میری اماں اور بہنیں پانی پت میں تھیں اور میں بمبئی میں۔ جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے آنے کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہو گیا۔ اور وہ سب پاکستان "ہجرت" کی تیاری کرنے لگے۔ تو میری ماں پر بھی دوسرے عزیز رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آ جاؤں۔ مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "ہم اپنا وطن

نہیں چھوڑینگے۔ میرے بیٹے نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اس فیصلے میں مَیں اس کے ساتھ ہوں"۔

فسادات کے بیس بائیس دن انہوں نے پانی پت میں گزارے۔ سات سات دن کا کرفیو لگتا۔ گھر میں چٹنی روٹی کھاکر گزارہ کرنا پڑتا۔ اور پان جو اماں کی زندگی کا اہم جزو تھا، روپے میں ایک پتہ نصیب ہوتا جس کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے وہ دن بھر گزارہ کرتیں۔ پھر ایک ملٹری ٹرک ان سب کو نکالنے کے لئے دہلی سے پانی پت بھیجا گیا۔ اور راتوں رات برقعہ پوش عورتوں کو اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ بیس دن وہ سب دہلی میں رہے۔ تیس آدمی ایک کمرے میں بند۔ اور اس عرصے میں خبر آئی کہ پانی پت میں ہمارے مکان لُٹ گئے اور شرنارتھیوں نے ان پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان حالات میں وہ ہوائی جہاز سے بمبئی آئیں۔ زندگی میں پہلی بار جان بچانے کے لئے برقعہ ترک کرنا پڑا۔ میں ڈر رہا تھا کہ ان سب باتوں کا اثر ان کے مزاج پر نہ جانے کیسا پڑا ہوگا۔ مگر پہلے الفاظ جو ایئرپورٹ پر میں نے ان سے سُنے وہ یہ تھے۔ "بھئی میں تو اب ہمیشہ ہوائی جہاز میں سفر کیا کرونگی۔ بڑے آرام کی سواری ہے"۔

اور اس رات پانی پت اور دہلی کے حالات سُناتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "نہ یہ اچھے، نہ وہ اچھے، نہ مسلمانوں نے کسر اٹھا رکھی ہے، نہ ہندوؤں اور سکھوں نے۔ سب کے سروں پر خون سوار ہے۔ مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تو مسلمانوں کو زیادہ الزام دونگی کہ انہوں نے اپنی حرکتوں سے اسلام کا نام

ڈبو دیا۔"

میرا ایک پنجابی شرنارتھی ہندو دوست ان دنوں میرے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سُن کر کہ اس کے شہر شیخوپورے میں بہت سے ہندو مارے گئے ہیں اور میرے دوست کے گھر والے راتوں رات وہاں سے پیدل چل کر ہندوستان کے کسی شرنارتھی کیمپ میں پہنچے۔ میری ماں بہت دیر تک روتی رہیں اور پھر مجھے الگ لیجا کر کہا۔ "دیکھنا یہ لڑکا آج سے تمہارا بھائی ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ شاید اس طرح سے ہم ان گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں جو ہمارے ہم مذہبوں نے کئے ہیں۔" رواداری اور انسان دوستی کی قدریں میں نے کسی کتاب سے نہیں حاصل کیں، اپنی ماں کی شخصیت سے ورثے میں پائی ہیں۔

شخصیات جنہوں نے مجھے متاثر کیا! یہ فہرست تو لمبی ہوتی جا رہی ہے، کس کس کا نام گناؤں؟ اپنے رشتے داروں میں ایک اور ہستی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ ہیں میرے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیّدین جو آج گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشنل منسٹری کے سکرٹری ہیں۔ لیکن میں بچپن سے آج تک انہیں "بھائی جان" ہی کہتا آیا ہوں۔ میرے خیال میں بچپن میں ہر کسی کا ایک (Ideal) ہوتا ہے۔ اور عام طور سے وہ اُس کا بڑا بھائی ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بچہ اس کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ جیسے "کیو" میں اگلے آدمی کی نقل و حرکت کی ہم پیروی کرتے ہیں اس طرح بچپن میں لاشعوری طور پر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ میرا اپنا کوئی سگا بھائی نہیں تھا۔ اس لئے بچپن سے ہی اپنے چچازاد بھائیوں ہی کو میں سگا بھائی

سمجھتا تھا۔ بھائی جان مجھ سے دس برس بڑے ہیں۔ جب میں پانی پت کے پرائمری اِسکول میں پڑھتا تھا تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ چھٹیوں میں جب وہ آتے تو ان کی موٹی موٹی انگریزی کی کتابوں اور ٹینس کے ریکٹ کا مجھ پر بڑا رعب پڑتا۔ وہ اپنے یونیورسٹی میگزین کے لئے کبھی بیٹھ کر کوئی مضمون لکھتے تو میرا بھی جی چاہتا کہ میرے قلم میں بھی کسی دن ایسی طاقت آجائے کہ میں یوں بے تکان مضمون لکھ سکوں۔ اور پھر وہ اِنگلستان پڑھنے گئے اور وہاں سے اُن کے خط اور تصویر والے پوسٹ کارڈ آنے لگے۔ تو ہمارے لئے اور بھی دلچسپی اور حیرت اور رشک کا سامان ہوگیا۔ لندن۔ لیڈز۔ کیمرج۔ آکسفورڈ۔ پیرس۔ برلن۔ جینوا۔ ہم اپنے اسکول کے اٹلس میں اِن شہروں کو ڈھونڈنے لگے اور وہاں سے آئی ہوئی تصویروں کو سنبھال کر البم میں لگانے لگے۔ اور دل ہی دل میں سوچتے۔ کیا کوئی دن ایسا بھی آئیگا کہ ہم بھی اس وسیع اور رنگین دنیا کی سیر کر سکیں گے۔ اور پھر وہ ولایت سے واپس آگئے۔ فرسٹ کلاس ڈگری لے کر۔ اور علی گڑھ میں پروفیسر بھی ہوگئے۔ اس سال علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ سنہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ اپنے نانا کے ساتھ میں بھی اصرار کرکے علی گڑھ پہنچا۔ یونیورسٹی کی شاندار عمارتوں اور جوبلی کے ہنگاموں کا رعب تو پڑا ہی لیکن سب سے زیادہ رعب پڑا اُس ڈبیٹ کا جو جوبلی پنڈال میں ہوئی اور جس کے ہیرو ہمارے بھائی جان قرار پائے۔ اگر میں کسی ایک واقعہ کو یاد کروں جس نے میری زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے تو وہ یہی ڈبیٹ ہوگی۔

کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں

کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح۔ سر آغا خان۔ سر محمد اقبال۔ سر علی امام۔ ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ" ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہئے اپنی سیاسی تنظیم علٰحدہ نہیں کرنی چاہیئے۔" یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی۔ اور اس کی مخالفت کی اُن تمام مشاہرین و قائدین نے جو وہاں موجود تھے۔ میں تو اس وقت انگریزی نہیں کے برابر سمجھتا تھا۔ لیکن یہ میں دیکھ سکتا تھا کہ بھائی جان نے تقریر کی تھی اسٹیج کی دائیں طرف سے اور سب بڑے لوگ بول رہے تھے اُن کی مخالف سمت سے۔ جب اُن سب کی تقریریں ختم ہوگئیں تو تجویز پیش کرنے والے نوجوان کو جواب الجواب دینے کا حق دیا گیا۔ اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ انگریزی الفاظ نہ سمجھنے پر بھی میں اُن کے زورِ کلام کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ کتنی روانی تھی ان کی تقریر میں، کتنا سلجھا ہوا اور مدلل تھا ان کا انداز، کیسا جادو تھا ان کی آواز میں کہ ہر شخص سحور اور مبہوت بنا ہوا ہمہ تن گوش سُن رہا تھا۔ کتنا خلوص اور کتنا جوش تھا اُن کے بیان میں کہ جب اُنکی تقریر ختم ہوئی تو سارا ہنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور مسٹر علی امام جنہوں نے تجویز کی مخالفت کی تھی اٹھے اور اپنے نوجوان حریف کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد جب حاضرین کی رائے لی گئی تو کثرت رائے تجویز پاس ہو گئی۔ اور میرے دھڑکتے ہوئے دل نے مجھ سے کہا۔" کتنے قابل ہیں میرے بھائی جان، کتنی اچھی تقریر کی انہوں نے، ایک دن میں بھی اُن جیسا ہونگا

اُن جیسی تقریریں کروں گا۔ مگر اس کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑے گا۔ لکھنے اور بولنے کی کوشش کرنی پڑیگی۔ بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا.... مگر میں سب کچھ کروں گا۔ سب کچھ کروں گا۔

اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا، پھر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، پھر جج، پھر ڈپٹی کمشنر، اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

ان کے علاوہ وہ شخصیتیں بھی ہیں جن سے میں ہی نہیں میری نسل کے کروڑوں ہندوستانی متاثر ہوئے ہیں۔ اور جن کی "چھاپ" ہم سب کی زندگی اور کردار پر موجود ہے۔

مہاتما گاندھی۔ ان کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تھا اس وقت میری عمر صرف پانچ یا چھ برس کی تھی۔ لیکن اس وقت بھی ان کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

بھگت سنگھ۔ جس کی شہادت کے دن میں اور میرے بہت سے کالج کے ساتھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے جیسے ہمارا سگا بھائی پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو!

جواہر لال نہرو۔ جن کو کالج کے دنوں میں ہم نوجوانوں کا لیڈر سمجھتے تھے اور جن کی انقلابی اور اشتراکی تقریروں اور تحریروں کا ایک ایک لفظ ہمیں حفظ یاد ہو تا تھا۔

منشی پریم چند۔ جن کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف

رومان اور قرار ہی نہیں ہوتا انسانی زندگی کی سچی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

پورن چند جوشی۔ جن سے مل کر مجھے معلوم ہوا کہ کمیونسٹ مارکسی اصولوں کو دہرانے والی مشینیں ہی نہیں ہوتے انسان اور انسان دوست بھی ہوتے ہیں۔

زندگی کی مختلف منزلوں اور موڑوں پر میں ان سب ہی سے تو متاثر ہوا ہوں۔

اور واقعات؟

پہلا ناقابل فراموش واقعہ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ جب میں صرف چار پانچ برس کا تھا اور پانی پت میں پرائمری اسکول کی پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا۔ اور تمام پنجاب کی آبادی کو اطاعت اور وفاداری کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ سڑک اعظم (جو دہلی سے پشاور جاتی ہے) کے کنارے جتنے شہر اور قصبے تھے ان کے تمام اسکولوں کو حکم ملا کہ اپنے بچوں کو سڑک کے کنارے قطاریں بنا کر کھڑا کریں کیونکہ وہاں سے انگریزی گھوڑا سوار فوج کے رسالے گزرنے والے تھے۔ صبح سویرے سے سہ پہر تک ہم گرمیوں کی دھوپ میں وہاں کھڑے رہے۔ کئی بچوں کو لُو لگ گئی۔ ایک بھوک اور دہشت سے بیہوش ہو گیا۔ تب جا کر انگریز فوجیوں کے لال لال چہروں کے درشن ہوئے۔ اس زمانے میں ایٹم بم اور راکٹ تو ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ لیکن انگریزی فوج کے پاس جتنے بھی بھیانک ہتھیار تھے وہ سب ہی تو اس جلوس میں ہمارے سامنے سے گزارے گئے۔ توپیں، مشین گنیں۔

رائفلیں۔ بندوقیں۔ پستول۔ بھالے۔ تلواریں ہمارے دلوں پر برطانوی سامراج کی ہیبت بٹھانے کے لئے یہ جلوس تین گھنٹے تک سڑک اعظم سے گزرتا رہا۔ اور ہم کھڑے دیکھتے رہے۔ لیکن جس مقصد سے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا، اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ بچوں کے دلوں میں اس فوج کے رعب یا خوف سے کہیں زیادہ نفرت بھری ہوئی تھی۔ شام کو جب ہم بھوکے پیاسے نڈھال ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تب بچے یا تو ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے "ارے کیسے لال لال منہ کے انگریز تھے، جیسے بندریوں بندر" اور یا تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کے گیت گا رہے تھے۔ جیسے :-

"کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو"

اور اس دن ایک چار یا پانچ برس کے بچے نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ "میں ان انگریزوں کی سرکاری نوکری نہیں کرونگا" اور اب چالیس برس بعد بھی جب انگریز سرکار ختم ہو چکی ہے اور آزاد ہندوستان کی اپنی قومی حکومت قائم ہو چکی ہے نہ جانے کیوں اب بھی میں سرکاری نوکری کے خیال سے گھبراتا ہوں۔

دوسرا ناقابل فراموش واقعہ۔ شاید ۲۳ء کی بات ہے۔ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا سائیکل چلانے کا شوق ہوا تھا۔ چند دوستوں نے طے کیا کہ سائیکلوں پر آگرے جائیں گے جو علی گڑھ سے کوئی اسی ۸۰ میل ہے۔ دُھن تو تھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کی لیکن راستے میں کسی کی سائیکل کا ٹیوب پھٹ گیا۔ اُسے ٹھیک کرنے کے لئے ایک

گاؤں میں دو پہر ٹھہرنا پڑا۔ اس گاؤں کی غربت کی تصویر آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ ٹوٹے پھوٹے کچے مکان۔ لوگوں کے پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے، جھونپڑوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا گندا نالہ جس پر گرد، مکھی اور مچھر بھن بھنا رہے تھے۔ دُبلے پتلے سوکھے جسم کے ننگے بچے جو بھیک مانگنے کیلئے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور ہر چہرے پر نہ صرف افلاس بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ایک عمیق مایوسی کی چھاپ، جیسے انہیں یقین ہو کہ ان کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی ....

اُس وقت تک میں نے سوشلزم پر دو چار کتابیں پڑھی تھیں۔ لیکن اُس دن میں قطعی طور پر اشتراکیت پر ایمان لے آیا۔

۳۸ء میں میں نے دنیا کا سفر کیا اس سفر نے میرے دماغ کو قوم پرستی کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی اشتراکیت کی شاہراہ پر لے آیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ امریکہ میں سرمایہ داری کی اتنی صنعتی ترقی کے باوجود بھی افلاس ہے اور انگلستان میں سامراجی روایات کے باوجود ترقی پسند اور اشتراکی حلقوں میں ہندوستان کے قوم پرستوں کیساتھ ہمدردی ہے، اور جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور مسولینی ایک مکروہ اور بھیانک فلسفے کی تعلیم دے رہے ہیں اور اسپین میں فاشزم اور جمہوریت کے درمیان آنیوالی جنگ کا ریہرسل ہو رہا ہے ....

اسی سفر کے دوران میں میں نے نیویارک کے قریب ایک قصبے پوکیپسی (POUGHKEEPSIE) میں تمام دنیا کے نوجوانوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کی جو فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ آج کل تو تقریباً ہر سال ہی کہیں نہ کہیں نوجوانوں کے ایسے بین الاقوامی جمگھٹے ہوتے رہتے

ہیں۔ پچھلے سال میں ماسکو میں تھا جب وہاں لگ بھگ سو قوموں اور ملکوں سے آئے ہوئے چالیس ہزار نوجوان اکٹھے ہوئے۔ لیکن ۱۹۳۸ء میں نوجوانوں کی بین الاقوامی تحریک کی ابتدا ہوئی تھی۔ ہماری کانفرنس میں صرف چھ سات سو نمایندے شریک ہوئے تھے، جو شاید ۳۰ - ۳۵ ملکوں سے آئے تھے۔ لیکن پھر بھی کئی وجوہ سے اس کانفرنس کا گہرا نقش میری یاد پر آج تک موجود ہے۔ میرے (اور دوسرے نمایندوں کے لئے بھی) اتنے مختلف ملکوں کے نوجوانوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ امریکن، انگریز، فرانسیسی، جرمن (جو ہٹلر کی خفیہ پولیس سے چھپ کر آئے تھے) اطالوی جو مسولینی کے چنگل سے کسی طرح چھٹ کر آئے تھے، میرے جیسے ہندوستانی نوجوان جو برطانوی سرکار سے مختلف بہانوں سے پاسپورٹ لے کر کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچ پائے تھے۔ چینی نوجوان جو جاپانی فاشزم کے خلاف اس وقت بھی برسرپیکار تھے۔ سیاسی اعتبار سے اس کانفرنس میں حیرت انگیز تنوع تھا۔ کہنے کو تو اس کے بارے میں بھی مخالفین نے کہا اور لکھا تھا کہ یہ کمیونسٹوں کا ڈھونگ ہے۔ لیکن اس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، لبرل، قوم پرست اور یہاں تک کہ برطانیہ کی قدامت پرست CONSERVATIVE پارٹی کے وہ نوجوان افراد تک شامل تھے جو ونسٹن چرچل کی پیروی میں فاشزم کے مخالف تھے۔ ہندوستان سے جو نمایندے گئے تھے ان میں علاوہ اور نوجوانوں کے مرحوم یوسف مہر علی تھے۔ جو اس وقت بھی سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ موجودہ پارلیمنٹ کی کمیونسٹ ممبر رینو چکرورتی تھیں۔ جو اس وقت انگلستان میں پڑھتی تھیں اور شاید اس وقت بھی کمیونسٹ پارٹی میں تھیں۔ اس کانفرنس کے مباحثوں کا ایک

دلچسپ پہلو جو مجھے ابھی تک یاد ہے وہ یہ تھا کہ نمایندوں کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی خاطر کچھ عرصے کے لئے سامراج، اور سرمایہ داری کے خلاف جد و جہد کو ملتوی یا کم کر دینا چاہیئے۔ تاکہ امریکہ کے لبرل عقیدے کے سرمایہ داروں اور فرانس اور انگلستان کے ان سیاست دانوں کو بھی جو سوشلسٹ نہیں تھے ہٹلر اور مسولینی کے خلاف جہاد میں شامل کیا جا سکے لیکن ہم ہندوستانیوں کے لئے تو برطانوی سامراج اور جرمن فاشزم میں کوئی فرق نہیں تھا اور اگر کوئی فرق تھا بھی تو وہ یہی تھا کہ ایک بلا ہمارے گھر میں موجود تھی اور دوسری آفت کے بارے میں ہم نے صرف سنا تھا۔ جب کانفرنس کا بنیادی رزولیوشن پیش ہوا تو اس میں سامراجی مقبوضات اور نوآبادیات کے لئے مکمل آزادی کے بجائے بتدریج جمہوری خود مختاری کا مطالبہ رکھا گیا تھا۔ بھلا اس سے ہم ہندوستانی قوم پرستوں کی کہاں تسکین ہوتی۔

ہندوستان کی طرف سے مجھے اس تجویز پر بولنا تھا۔ میں نے برطانوی اور فرانسیسی سامراج کے خلاف اتنی شد و مد سے تقریر کی اور اتنے زور و شور سے ہندوستان اور ایسے دوسرے ملکوں کے لئے فوری مکمل آزادی کا مطالبہ کیا کہ برطانیہ اور فرانس کے غیر سوشلسٹ نمایندوں نے تو کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن تقریر کے ختم پر باقی نمایندوں نے خوب زور سے تالیاں بجائیں اور پلیٹ فارم سے نیچے اترتے ہی مجھے کئی ملکوں کے نوجوانوں نے گھیر لیا۔ اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملانے لگے۔ ان میں سے ایک جرمنی سے نکالا ہوا فاشسٹ دشمن نوجوان تھا۔ جس کے چہرے کی

میگزین میں اسکی چھپی ہوئی مصیبتوں کی کہانی لکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف محاذ بنانے کی خاطر ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم ہندوستانیوں سے کہیں کہ تم سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کو بند کردو۔ یقین مانو کہ ہم ہندوستان کی تحریک آزادی کے پورے پورے حامی ہیں۔ ایک انگریز ترقی پسند نوجوان نے بھی آکر مجھ سے کہا کہ میری تقریر سنکر اُسے یقین ہوگیا تھا کہ فاشزم کے خلاف بین الاقوامی محاذ بنانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہی تھی کہ ہندوستان جیسے ملکوں کو جلد از جلد مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیئے تاکہ ان کے عوام فاشزم کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ ان دونوں کی باتوں کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور اس کے بعد گو ریزولیوشن میں صرف اتنی ترمیم ہوئی کہ ہندوستان اور دیگر سامراجی مقبوضات میں فوری جمہوری آزادی کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ لیکن پھر بھی جو نوجوان شریک ہوئے تھے ان میں سے بیشتر نے اتنے جوش و خروش سے ہماری آزادی کی حمایت کی کہ اس کانفرنس کا نقش اب تک میرے دل پر تازہ ہے۔

وہ کانفرنس فاشزم اور جنگ کو روکنے کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ لیکن بہت دیر میں ہوئی۔ اس کانفرنس کے ختم پر میں فرانس اور انگلستان اس وقت پہونچا جب برطانوی وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین ہٹلر سے چیکوسلواکیا کا سودا کر رہے تھے، اور ابھی سال بھر بھی نہیں گذرا تھا کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔

میرے جیسے سب ہی ترقی پسند فاشسٹوں اور نازیوں کے مخالف تھے۔ لیکن ہمارے اپنے ملک میں تو برطانوی سامراج ہمارے سر پر سوار تھا۔

اگست ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہماری جنگ آزادی کا آخری دور شروع ہوا۔ اس زمانے کے دو واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا۔

۸ اگست کو کانگریس نے برطانوی سرکار کو الٹی میٹم دے دیا۔ اسی رات کو سب لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ اگلے دن اعلان ہوا کہ شیواجی پارک میں ایک عام جلسہ ہوگا جس میں کستوربا گاندھی تقریر کریں گی۔ وہ شام مجھے آج تک یاد ہے پارک کا سارا میدان میدان جنگ کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ مگر یہ "جنگ" اس جنگ سے کتنی مختلف تھی، جو یورپ میں ہو رہی تھی۔ یہاں ایک طرف لگ بھگ ایک لاکھ نہتے مرد، عورت، بچے۔ دوسری طرف ہزاروں مسلح پولس والے ان کے اور ان کے درجنوں انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کے پاس ہر قسم کے ہتھیار، لاٹھیاں، بندوقیں رائفلیں، ریوالور، لاریوں پر چڑھائی ہوئی مشین گنیں۔ اور رُلانے والی گیس کے بم، کئی گھنٹے یہ "جنگ" جاری رہی۔

لاٹھیاں برسائی گئیں، رائفلوں سے فائر کئے گئے، رلانے والی گیس کے سینکڑوں بم چھوڑے گئے، جن سے چاروں طرف زہریلے بادل چھا گئے، جن کے قریب آتے ہی بے اختیار آنکھوں میں مرچیں لگ کر آنسو بہنے لگتے تھے اور انسان تقریباً اندھا ہو جاتا تھا۔ لیکن مجمع نے ہار نہیں مانی۔ اگر ایک جھنڈا بردار لاٹھی کھا کر گرا تو دوسرے نے ترنگا سنبھال لیا۔ اگر کوئی گولی کھا کر گرا تو والنٹیر اُسے فوراً اٹھا کر لے گئے۔ اور اسکی جگہ دوسروں نے لے لی۔ گیس کا مقابلہ کرنے کے لئے کسی نے یہ نسخہ نکالا کہ رومال پانی میں بھگا کر چہرے کو ڈھانک لیا جائے تو گیس کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف کی عمارتوں سے عورتیں بالٹیاں

نے کر نکل پڑیں۔ اور نہتّے سورما ایک بار پھر پولس اور فوج کے مقابلے میں ڈٹ گئے، جھنڈے لہرائے گئے۔ پولس کے باوجود پارک کے کونے کونے میں جلسے ہوئے، آزادی کا ریزولیوشن بار بار پڑھا گیا۔ تقریریں ہوئیں۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ اور ایک لاکھ بمبئی نواسیوں نے اس شام عدم تشدد پر قائم رہتے ہوئے بھی سامراجی پولس اور فوج کو شکست فاش دی۔

"جنگ آزادی" یہ دو لفظ تو بچپن سے سنتا آیا تھا، سینکڑوں بار اپنی تقریروں اور مضامین میں بھی یہ لفظ دہرائے تھے۔ لیکن اس شام میں نے اپنی آنکھوں سے اس "جنگ آزادی" کو دیکھا، اور اس میں شرکت کی۔ میری کمر پر بھی لاٹھی کی ایک ضرب لگی۔ زہریلی گیس کے اثر سے میں بھی وقتی طور پر اندھا ہوگیا۔ اور جب لوگوں نے دیکھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو کوئی دو انجانے ہاتھ مجھے سہارا دیتے ہوئے ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر لے گئے۔ اور مرہٹی زبان میں نہ جانے کیا کہہ کر نہ جانے کس کے سپرد کر گئے۔ اس گھر کے کسی فرد نے میرا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا اور میری آنکھوں پر پانی میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی چرمراہٹ کم ہو رہی ہے رومال ہٹا کر میں نے دیکھنا چاہا تو پہلے تو ہر چیز دھندلی نظر آئی، جیسے میلے شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن جلد ہی آنکھوں کا فوکس ٹھیک ہوگیا، دیکھا کہ دیواروں پر بھگوان کرشن، شیو مہاراج، دیوی لکشمی اور شیواجی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں پوجا کی جگہ ہے، جہاں مورتی رکھی ہوئی ہے۔ چراغ جل رہے ہیں، پھول رکھے ہیں، اور ایک بوڑھی عورت پوجا کر رہی ہے۔

سولہ برس پہلے تو چھوت چھات کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ میں اتنے مذہبی اور پوجا پاٹھ کے ماحول میں ہوں، یہ دیکھ کر میں کسی قدر سٹ پٹا کر اٹھ بیٹھا۔

پلنگ کی چوں چوں سن کر بڑی بی نے مڑ کر دیکھا، پھر مورتی کی طرف جلدی سے سر جھکا کر پوجا کو بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

میرے پاس آکر مرہٹی میں بولیں۔ "کیوں اٹھ کیوں گیا، بٹیا۔ کچھ دیر اور آرام کر۔"

میں تھوڑی سی مرہٹی سمجھتا ہوں، مگر بول نہیں سکتا، سو میں نے جواب ہندوستانی میں دیا۔ میں نے کہا:

"نہیں اب میں ٹھیک ہوں۔ رات ہوگئی ہے، اب مجھے جانا چاہیے"

"نہیں نہیں۔ پہلے دودھ پی لے۔" اور یہ کہہ کر وہ اندر گئیں اور ایک تانبے کے گلاس میں گرم گرم دودھ لے کر آئیں۔

میں نے سوچا اتنی مہربان دیوی کے دھرم کو کیوں بھرشٹ کروں، سو میں نے دودھ کا گلاس نہیں لیا اور کہا:

"ماں جی میں مسلمان ہوں"

میرا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ سوچ میں تو ضرور پڑ جائینگی کہ اب اس ملیچھ سے کیسے برتاؤ کیا جائے۔ مگر انھوں نے ایک سکنڈ بھی توقف نہیں کیا اور بولیں:۔

"تو پھر کیا ہوا؟" اور یہ کہہ کر مجھے دودھ کا گلاس پکڑا ہی دیا۔

میں نے دودھ کا ایک گھونٹ پی کر کہا "شما کرنا ماں جی۔ میری وجہ سے آپ کی پوجا پوری نہ ہوگی۔"

اس بوڑھی، گمنام، شاید ان پڑھ مرہٹہ خاتون کا جواب سن کر میں ششدر رہ گیا۔ بولیں۔

"سو کیا ہوا، بیٹا۔ یہ بھی تو پوجا ہی ہے۔"

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں گاندھی جی کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے اور اس تصویر میں وہ مسکرا رہے ہیں۔ اور ان کی مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"دیکھا تم نے۔ انقلاب یوں بھی آتا ہے۔ دھیرے دھیرے دل کے راستے۔"

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء۔ آزادی کا پہلا دن۔ کسی قوم کی زندگی میں یہ دن ایک ہی بار آتا ہے۔ اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ دن ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آزادی کے اس جشن میں شرکت کی۔ اس "واقعہ" سے متاثر ہوئے بغیر بھلا کون رہ سکتا تھا۔ بمبئی میں گوالیا ٹینک کے میدان سے وہ یادگار جلوس چلا جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ میری یاد میں پہلی بار اور (فی الحال) آخری بار تمام سیاسی پارٹیوں، تمام فرقوں اور جاتیوں اور ہر پیشے کے لوگوں نے مل کر ایک قومی تہوار منایا۔ کانگریسی۔ سوشلسٹ، کمیونسٹ، ہندو مہاسبھائی، جن سنگھی، مسلم لیگی۔ اس روز ہر مسلک کے پیرو ایک ہی رخ، ایک ہی راستے پر دوش بدوش چل رہے تھے۔ ادیب، کالجوں کے پروفیسر،

طالب علم، مل مزدور، کلرک، چپراسی، تاجر، سیٹھ اور بھنگی اور جوتا پالش کرنے والے چھوکرے اور مشہور فلم اسٹار اور بین الاقوامی شہرت کی ناچنے والیاں اور چھوٹے موٹے دوکاندار اور ہوٹلوں کے بیرے اور باورچی اور بھکاری اور فقیر، اور لکھ پتی اور سرکاری افسر اور بے کار ——— وہ جلوس نہیں تھا ساری ہندوستانی قوم تھی جو سڑکوں پر امڈ آئی تھی۔ اور آزادی کی خوشی میں نعرے لگا رہی تھی گا رہی تھی، ناچ رہی تھی۔ ایک مشہور اور مقبول فلم ایکٹر ڈھول بجا رہا تھا اور اسی کی لے پر ایک پڑھی لکھی کھاتے پیتے خاندان کی لڑکی جو لندن اور پیرس اور نیویارک کی اسٹیج پر ناچ آئی تھی ناچ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک کالا سا، دبلا سا مل مزدور ناچ رہا تھا اور ایک ادیب اور جرنلسٹ نہایت بھونڈے اور بھدے طریقے سے ان دونوں کے ساتھ ناچنے کی بالکل ناکام کوشش کر رہا تھا اور وہ ادیب جرنلسٹ میں تھا۔ نہ جانے اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا؟ نہ جانے ہم سب کو، لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کو اس دن کیا ہو گیا تھا؟ نہ جانے پھر ہم سب کے سر پر وہی جنون کب اور کیسے سوار ہو گا؟

ابھی پندرہ اگست کے نعرے فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ شمال مغرب اور شمال مشرق سے فرقہ وارانہ قتل و خون کی خبریں آنے لگیں۔ بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی، نہتے راہ چلنے والوں پر قاتلانہ حملے ہونے لگے۔ اس ہولناک زمانے کے کئی واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا۔ اور ان میں سے اکثر کے بارے میں اپنے مضامین اور افسانوں میں لکھ چکا ہوں۔ مگر ایک واقعہ ایسا ہے جس کا میں نے اب تک کسی سے ذکر نہیں کیا۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر "محفوظ مسلم علاقوں" میں چلے گئے۔ صرف میں اور میری بیوی اپنی سمندر کے کنارے والی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند فرقہ پرور سنگھی سورماؤں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ لیکن میں نے سوچا اگر شیواجی پارک میں میرے لئے زندہ رہنا ناممکن ہے تو زندہ رہنا ہی بیکار ہے۔ میں وہیں رہا۔ ایک شام کو اندھیرا ہونے کے بعد دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اترا تو دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں۔ معلوم ہوا کہ قتل کی چند وارداتیں ہو چکی ہیں اس لئے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری سی گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے (میں فطرتاً کوئی بہت بہادر نہیں ہوں، اگر میں اس خطرناک زمانے اور اس خطرناک علاقے میں اندھیرے اجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا) میں نے سوچا آج ضرور میری موت آ گئی۔ مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ شخص جو بھی تھا مجھ سے چند قدم پیچھے ہی چلا آ رہا تھا۔ مرنا ہے تو پیٹھ میں چھرا کھا کر کیوں مروں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آ گیا ہے تو میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ

بیچارہ ڈر کر ٹھٹک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔
اس کو اطمینان دلانے کے لئے میں نے پوچھا۔ "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"
اس نے کہا "ہاں۔ نو بجے کا کرفیو ہے ادھر۔ مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"
اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔
"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"شیواجی پارک۔ اور تم؟"
"میں بھی شیواجی پارک"
"وہاں رہتے ہو کیا؟"
"ہاں"
"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"
میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا۔ اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا دسنت ڈیسائی ہے۔ اور اگر اس نے جرح شروع کر دی۔ اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ کیا یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔
سو میں نے کہا:۔ "میرا نام ہے احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس"

اس نے کہا "تم پیپر میں کام کرتے ہونا؟"
میں نے کہا "ہاں بمبئی کرانیکل میں"
"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو؟"
میں نے کہا "ہاں کئی برس سے یہیں رہتے ہیں ہم"
اور اتنے میں ہم پولس کے سپاہیوں کے ایک گروہ کے قریب سے گزر کر کرفیو کی حدود سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آ گئے۔
میرے ہم راہی نے کہا "میٹنگ میں چل رہے ہو، عباس بھائی"
میں نے کہا "کون سی میٹنگ"
"سورکشن دل بنا رہے ہیں نا۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہوں گے"
میں نے کہا "تو ضرور چلتا ہوں"
سو ہم دونوں اکٹھے اس جلسے میں داخل ہوئے۔ سو سوا سو آدمی موجود تھے۔ اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے۔ "آؤ آؤ عباس بھائی" چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔
تجویز پیش کی گئی کہ فسادات کی روک تھام کے لئے اور شیواجی پارک کے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے ایک سورکشن دل (خود حفاظتی دستہ) بنایا جائے۔ کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چنا گیا اس کا نام تھا ——— خواجہ احمد عباس۔
اور جن لوگوں نے میرے نام کی موافقت میں ہاتھ اٹھائے ان میں

وہ آدمی بھی تھا جسکو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھ رہا تھا۔
میں نے ارادہ کیا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں گا، اس کا نام پتہ پوچھوں گا۔ لیکن جلسے کے ختم پر جو بات چیت اور بحث مباحثہ اور افراتفری ہوتی ہے اس میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔۔۔۔

مگر اس کے بعد میں بدترین فسادات کے دوران میں بمبئی کے ہر علاقے میں گھوما، دہلی اور پانی پت گیا، کشمیر گیا۔ جب سارا ہندوستان اور پاکستان نفرت اور غصے اور انتقام کے خونی سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن جہاں کہیں بھی میں گیا خود میں نے تو معمولی انسان ہی دیکھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان۔ نہ مجھے کسی سے خوف ہوا نہ کسی نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور مجھے ایسا لگا کہ دراصل یہ فسادات، یہ خون خرابے، یہ لوٹ مار، یہ مار دھاڑ، اس وقت ہوتی ہے جب تعصب اور نفرت کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں ہر راستہ چلتا ایک خونی اور ڈاکو نظر آتا ہے۔ اور ایک دوسرے کا خوف ایک دوسرے پر حملہ کراتا ہے، ایک دوسرے کا خون کراتا ہے۔

اور اپنی یادداشت کے اندھیرے میں اب بھی میں اس گمنام، انجانے ہم راہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں۔ اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اسکی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟" نام کیا ہے تمہارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں "احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔ جو چوالیس برس ہوئے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔ پانی پت جو

نب بھی ہندوستان میں ہے۔ اور میرے نانا تھے خواجہ سجاد حسین۔ جنھوں نے بچوں کی تعلیم کے لئے اپنی ساری دولت، ساری عمر اور ساری طاقت خرچ کر دی، اور میرے والد تھے خواجہ غلام السبطین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا۔ کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا۔ اور سیاسی اختلافات میں روا داری سکھائی۔ اور میری والدہ تھیں مسرور ۃ النسا بیگم۔ جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی نہ کسی سیاسی جلسے میں شریک ہوئی تھیں۔ لیکن جو آخری دم تک اپنے ملک ہندستان کی وفادار رہیں۔ . . . . مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں۔ گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں۔ اور انسانیت اور سوشلزم کے ناتے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں —— روس میں اور امریکہ میں، انگلستان میں اور چین میں —— پھیلے ہوئے ہیں۔ اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثرانداز ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا ایک یوروپین شاعر جان ڈان JOHN DONNE نے کہا ہے:-

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے"

"ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے"

"ہر انسان زمین کا ایک ذرّہ ہے"

"ہر انسان کی موت میری موت ہے، کیونکہ میں اور انسانیت جدا نہیں ہیں"

. . . . . اور اسی طرح دن اور مہینے اور برس گزرتے ہیں۔ اور

شخصیات اور واقعات کا لامتناہی جلوس گزرتا رہتا ہے۔ اور جس طرح کیمرے کی فلم پر ہر منظر کا عکس (خواہ وہ صاف ہو یا دھندلا) پڑنا ضروری ہے اسی طرح ان واقعات اور شخصیات کا اثر قبول کرنا بھی میرے لئے (اور ہر کسی کے لئے) لازمی ہے۔ یہ سلسلہ ہر انسان کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور موت سے پہلے یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

پیدائش مارچ ۱۸۹۲ء میں ایک مذہبی اور کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی۔ والد ماجد ڈپٹی کلکٹر یا اس وقت کے معیار سے ایک اچھے اونچے عہدہ دار، کچھ زمینداری بھی، نوکر چاکر، گھوڑا گاڑی، وغیرہ۔ امیرانہ زندگی کے سامان شروع سے موجود، گھرانا سارا مذہبی، نماز، روزے کے چرچے آنکھ کھلتے ہی نظر پڑے۔

تعلیم حسب رواج وقت، اسکول میں داخلہ سے پہلے گھر ہی میں شروع ہوئی، پہلے قرآن مجید، پھر اردو (مولوی اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی ریڈروں کے ذریعہ سے) پھر فارسی۔ گلستاں، بوستاں، کیمیائے سعادت، سکندرنامہ، یوسف زلیخا وغیرہ۔ اور شدہ شدہ عربی۔ ساتھ ساتھ انگریزی بھی ——— پڑھنے کا شوق بچپن

ہی سے تھا۔ نصابِ درسی کے علاوہ خدا جانے اور کیا کچھ چاٹ گیا۔ کتاب، اخبار، رسالہ جو بھی چیز سامنے آگئی، بچ کر جانے نہ پائی۔ ریاض الاخبار، اودھ اخبار، اودھ پنچ۔ اور کتابوں میں شرر کے ناول۔ حالی کی نظمیں۔ نذیر احمد کے لکچر، بزرگوں کے ملفوظات، فقہ، اور مناظرے کے رسالے سب ہی کچھ دیکھ ڈالے۔

لکھنے کا مرض بھی کہنا چاہیئے مادر زاد لے کر آیا۔ عمر کا بارہواں سال تھا، اور تعلیم ساتویں درجے میں پا رہا تھا کہ مضمون نگاری (اگرچہ گمنام) شروع کر دی۔ اور روزنامہ اودھ اخبار (لکھنؤ) میں اکثر لکھتا رہا۔ نویں، دسویں تک پہنچتے پہنچتے دو رسالے بھی تیار ہو گئے۔ ایک مناظرہ میں، رَدِّ مسیحیت میں، دوسرا ایک یونانی الاصل انگریزی ڈرامے SAPHOCLES ANTIGONE کا اپنایا ہوا اردو ترجمہ، افسوس ہے کہ ان دونوں مسودات کا اب ایک ورق بھی محفوظ نہیں۔ ایک چچازاد بھائی عبدالحلیم اثر مرحوم تھے۔ یہ سب اثر ان کی تربیت کا تھا۔

وطن اور مولد دریاباد، ضلع بارہ بنکی کا ایک اوسط درجہ کا اور قدیم قصبہ ہے۔ لیکن اسکولی تعلیم ساری سیتاپور میں ہوئی، کہ والد مرحوم وہیں تعنات تھے۔ یہاں شیعہ حضرات کے ہاں مجلسوں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا اور اسی سے طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف ہوا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابیں ردِ آریہ میں اور مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی کتابیں بھی پڑھیں۔ اور ان سے متاثر ہوا ایک صاحب مولوی احسان اللہ عباسی وکیل گورکھپور تھے۔ ان کی الاسلام بھی موثر ثابت ہوئی۔ خواجہ غلام الثقلین کی تحریر و تقریر سے دل نے اثر قبول کیا۔
چودہواں سال تھا کہ مولانا شبلی کے زیرِ اثر آگیا۔ ان کی تحریروں نے

ان کے سارے پیش رَووں کا اثر ہلکا کر دیا۔ انھیں پڑھا اور خوب پڑھا۔ اور ان کا ایسا گرویدہ ہوا کہ فقرے کے فقرے ان کی تحریروں کے حفظ کرلئے، اور کوشش کرکر کے محاورات، ترکیبوں اور نشست الفاظ سب میں ان کی پیروی برسوں کرتا رہا۔

سولھویں سال ہائی اسکول پاس کرکے لکھنؤ آیا۔ اور یہاں لائبریریوں کا کھوج لگا کر انگریزی کتابوں پر بری طرح گرا۔ منطق و فلسفہ (خصوصاً نفسیات) سے خاص ذوق تھا۔ ملحد فلاسفہ کی کتابیں پڑھ پڑھ کر ان کا مرید ہوگیا۔ مِل، اسپنسر، ہکسلی وغیرہم کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اور مذہب سے بیگانہ کیا معنی، بالکل برگشتہ ہوگیا مدتوں یہ دور قائم رہا۔ اور اپنے کو بجائے مسلمان کے RATIONALIST کہتا رہا۔ ولیم جمیس امریکی سائکالوجسٹ وغیرہ کی کتابیں اس اثر کو تھوڑا بہت ہلکا کرتی رہیں۔ اور جن بزرگوں کی خدمت میں اب تک رسائی ہوچکی تھی، ان میں سے اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علیؒ اپنی والی تو بہت کچھ کرتے رہے۔

بی۔ اے کرچکا تھا۔ اور ایم۔ اے تک پڑھ کر بغیر اُسے پاس کئے تعلیم چھوڑ چکا تھا۔ ایک دوست کی ترغیب پر مطالعہ ہند و فلسفہ اور تصوف کا شروع کیا۔ ایک عالم ہی دوسرا نظر آیا۔ پتنجلی، جوگ، بشسٹ وغیرہ کے علاوہ سب سے زیادہ اثر مسز بسنٹ، ڈاکٹر بھگوان داس، آربند و گھوش، گاندھی جی وغیرہ کا پڑا۔ اور ایک مادہ پرست قایل اب عالم روحانیات کا بھی ہوگیا۔ گیتا (بذریعہ تراجم) کا نمبر سب سے اول نکلا ——— اور اس عبوری منزل کے بعد نمبر اسلامی تصوف کا آیا۔ اس دور میں بجلی کا سا اثر مثنوی مولانائے روم نے ڈالا۔ اور

دوبارہ اسلام کے قریب آگیا۔ پھر اور چیزیں بھی پڑھیں، محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن، مولانا شبلی کی سیرۃ النبی وغیرہا۔ اور اب ۱۹۲۱ء میں ۱۰، ۱۲ سال کے الحاد وتشکیک کے بعد از سر نو پورا مسلمان بنا۔ زندہ شخصیتوں میں اکبر اور محمد علی سے برابر فیض پہونچتا رہا۔

۳۶ سال کے سن میں (۱۹۲۸ء میں) حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانوی کی زیارت اور صحبت نصیب میں آئی۔ اس نے کہنا چاہئے کہ زندگی ہی سنوار دی۔ الفاظ اس احسان کا درجہ ادا کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔

خانگی زندگی بھی ایک انقلاب سے گذری۔ عمر کے اکیسویں سال ۱۹۱۳ء میں خاندان کی ایک لڑکی کی صورت دل میں اتر گئی۔ اور جواب تک ایک خشک مزاج فلسفی تھا، وہ یک بہ یک شاعری اور "رومانس" کی دنیا میں آگیا۔ یہی لڑکی تین سال بعد بیوی بن کر آئی۔ اور اسکی محبوبیت اس سن میں بھی آج تک قائم ہے۔

ادبی مشغلے اب بھی جاری ہیں۔ لیکن اصل مطمح نظر اب کوئی ۲۵ سال سے قرآن مجید کی خدمت ہے۔ انگریزی اور اردو تفسیریں مدت ہوئی لکھ چکا ہوں۔ اور دوسرے کام بھی قرآنیات کے سلسلہ میں جاری ہیں۔ صدق کے ذریعے جو صحافت کی خدمت ہو رہی ہے، وہ بھی اصلاً دینی و اصلاحی ہی ہے۔ اس کے بعد ادبی اور پھر کہیں جاکر سیاسی۔ خلافت کمیٹی وغیرہ کے ذریعے جو سلسلہ سیاسی خدمات کا تھا، وہ مولانا محمد علی کی وفات کے بعد سے بند ہو گیا ہے ان کے بعد کوئی سیاسی لیڈر ایسا نظر نہ آیا جس پر آنکھ بند کر کے اعتماد کیا جا سکے،

موثر شخصیتیں اس ۶۵ سال کی زندگی میں، چھوٹی بڑی، بہت سی ثابت ہوئیں اور بعض ان میں سے انگریزوں اور ہندوؤں کی ہیں۔ سب کے نام کہاں تک گنائے جائیں۔ جو موثر ترین تھیں، صرف ان کے نام درج کردیے گئے۔

مزاج میں غصہ بچپن سے بہت تھا۔ خاطر خواہ ماحول اور اعلیٰ تربیت نصیب ہی کس کو ہوتی ہے۔ غلط ماحول و غلط تربیت نے اس آگ کو اور تیز کردیا۔ طبیعت میں داعیہ و جذبہ غضب و اشتعال کا اب بھی جوں کا توں ہے، اس کے عمل مقتضیات کے ظہور میں اگر اب کچھ کمی آگئی ہے، تو یہ تقاضا سن کا نہیں (جیسا کہ اکثر لوگ غصہ وری کو شباب کے ساتھ، اپنی غلط فہمی سے، مخصوص سمجھتے ہیں۔) بلکہ اس میں دخل بہت زیادہ شیخ تھانویؒ کی صحبت کو ہے —— اور ایک غصہ ہی پر کیا موقوف ہے، خدا معلوم کتنے رذائل اخلاق میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور آج تک ڈوبا ہوا ہوں۔ اصلاح تھوڑی سی بہت جو کچھ نظر آتی ہے سب اسی شیخ کا فیض ہے۔ بیرونی دنیا اسے مبالغہ پر محمول کرے گی، لیکن اپنے تجربہ و مشاہدہ کو کیا کروں کہ اس شیخ کی زندگی، اصلاح، اعمال و اخلاق کے پہلو سے کیسی بے نظیر ہوئی ہے۔ دنیوی و اخروی دونوں زندگیوں کے لئے ایک مثالی یا نمونہ، اور وہ بھی کسی شدید مجاہدہ کا قدم درمیان میں لائے ہوئے بغیر۔

گاندھی جی کو بھی قریب سے دیکھا ہے، اگرچہ اہم اعتقادی غلطیوں سے قطع نظر کرلی جائے تو وہ بھی ایک بے لوث اور پاکیزہ، ستھری زندگی تھی — اور جہاں تک سچائی، حق گوئی، بے خوفی اور ہر قسم کے تصنع سے پاکی کا تعلق ہے

محمد علی کی زندگی، کیا ہندو اور کیا مسلمان، سارے لیڈروں کو ملا کر بھی بس اپنی نظیر آپ تھی۔

زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ ایک دوسرا عقد بھی، ایک صاحب اولاد بیوہ سے کیا۔ جس کا ایک محرک ان بیوہ کے ساتھ ہمدردی اور ان کی کفالت کا جذبہ بھی تھا۔ اس وقت اپنا سن ۳۸ کا تھا، اور ان کا کوئی ۲۶ ر ۲۷ کا رہا ہوگا۔ نباہ میں دشواریاں بہت زائد اور قسم قسم کی نظر آئیں، اس لئے چند ماہ کے بعد کوئی صورت بجز خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدگی کے باقی نہ رہی۔ —— اس نکاح و طلاق دونوں سے فطرت بشری، فطرت نسائی، اور خود اپنی فطرت سے متعلق معلومات کے وہ دہ گوشے سامنے آگئے، جو اس ذاتی تجربہ کے بغیر شاید ہمیشہ مخفی ہی رہتے۔

ذاتی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں میں اتنی عمر گذار کر جو خاص خاص تجربے حاصل ہوئے انھیں نمبروار ذیل میں درج کئے دیتا ہوں، کہ شاید ان سے کسی دوسرے کو کچھ نفع حاصل ہو جائے۔

۱۔ صحت جسمانی کا اہتمام، سارے بدنی شعبوں میں، شروع ہی سے ضروری ہے۔ بغیر اس کا خیال کئے، نادانستہ ایسی ایسی غلطیاں صادر ہو جاتی ہیں اور ایسی ایسی بے احتیاطیوں کی عادت پڑ جاتی ہے کہ آگے چل کر تلافی بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ اور سنبھلنے اور سدھرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی۔ آنکھ، دانت، کان، جسم کا ہر ہر عضو ایک بڑی نعمت

ہے، اور نعمت کا قاعدہ ہے کہ بے پروائی اور ناقدری کے بعد چھن ہی جاتی ہے۔

۲- یہی حال دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا ہے۔ اگر شروع ہی سے ان کی جڑیں مضبوط نہ ہوں تو آئندہ ہمیشہ خطرے محسوس ہوتے رہیں گے۔ اور یکسوئی اور دل جمعی، عمر کی کسی منزل پر بھی پہونچ کر مشکل ہی ہے۔

۳- دنیا میں اگر کوئی بڑا اور مستقل کام انجام دے جانا ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اپنے زعم و پندار میں اپنے کو بڑا سمجھ کر اچھالنے لگئے۔ یہ راہ ناکامی کی ہے۔ کامیابی اگر مقصود ہے تو اپنے کو سب سے چھوٹا بنا کر رکھیئے۔ دبائیے نہیں خود دبیئے۔ دنیا خود ہی آپ کو اپنائے گی۔ اور آنکھوں پر بٹھائے گی۔ خود غرضی، خود بینی اور خود ستائی کا راستہ، دین تو دین، دنیا میں بھی نقصان وخسران ہی کا ہے۔

۴- دیانت اور سچائی کو اپنا شعار بنائے رکھیئے۔ جو دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہی دھوکا کھاتا بھی ہے اور جو دوسروں کو گرانے کی فکر میں لگا رہتا ہے وہ آخر خود ہی گرتا ہے، خواہ اس نتیجہ کے ظہور میں دیر کتنی ہی لگے۔ "خدا کی خدائی میں دیر ہے اندھیر نہیں" یہ مقولہ بڑے تجربے کا ہے۔

۵- جذبات کو قابو میں رکھنے کی مشق شروع ہی سے ضروری ہے،

یہ سمجھنا کہ شباب گزر جانے پر جذبات خود ہی قابو میں آجائیں گے، ایک شدید مغالطہ ہے۔

۶. ماں کی محبت اور ماں کی خدمت کا ولولہ ایک بڑی دولت ہے۔ دنیا کی نعمتیں ایک طرف، اور یہ ایک نعمت ایک طرف، اس کی قدر ایک خاص سن آجانے کے بعد ہوتی ہے۔

۷. آخرت کا عقیدہ عقلی، منطقی، کلامی پہلوؤں سے قطع نظر عملی اعتبار سے بھی بڑا ہی قیمتی عقیدہ ہے۔ اپنے دل میں جب سے یہ عقیدہ اترا، پوری زندگی بامعنی بامقصد بن گئی۔ اس کے قبل افلاطون اور ارسطو۔ کینٹ اور ہیگل۔ مل اور اسپنسر کو چاٹ جانے کے باوجود، یہی زندگی گاندھی جی کے پُرمعنی الفاظ میں ایک "بے پتوار کی کشتی" تھی۔

۸. ہر معصیت، ہر نفس پرستی کا داعیہ جب تک ضعیف وخفیف رہتا ہے، عقلی دلائل روک تھام کے لئے کافی ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہی جذبہ نفسانی جب طوفان کی شدت اختیار کر لیتا ہے تو عقل واستدلال کے پیر اکھڑ جاتے ہیں۔ اور بدترین بدنفسی اور گندگی کے لئے یہی عقل کو کوئی نہ کوئی حیلہ جواز مل ہی جاتا ہے۔ اس آخری مرحلہ پر نفس سے مقاومت اور کامیاب مقاومت کی قوت صرف خوف خدا میں ہے۔ اس کے سوا کسی چیز میں نہیں

سلمیٰ صدیقی

کتاب کے عنوان سے میں اس الجھن میں مبتلا ہوگئی کہ زندگی کا ہر دن کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ لاتا ہے جو اپنے اندر ایک سبق یا عبرت پوشیدہ رکھتا ہے، تو اتنے بے شمار واقعات میں سے کن کن کو منتخب کیا جائے۔ لامحالہ ان ہی کو دہرانا پڑا جو اپنی نوعیت بلکہ شدت تاثر کی بنیاد پر قابل ذکر ہیں اور ذہن میں محفوظ بھی رہ گئے ہیں۔

میں نے ۹ سال کی عمر میں وہ کتابیں ختم کرلی تھیں جو ۱۹۱۰ء تک اوسط درجے کے شرفاء اپنی لڑکیوں کو پڑھانا مناسب سمجھتے تھے۔ ان میں زیادہ تر مذہبی، اخلاقی اور گھر داری کی تعلیمات ہوتی تھیں، اس سلسلہ میں ثواب و عذاب کے باب میں

غلاموں کو آزاد کرنا اور کرا دینا بھی ایک فریضہ بتایا گیا تھا۔ یہ پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ جب غلام اور لونڈیاں آزاد کر دیے جائیں گے تو ہمارے اتنے سارے کام کون کریگا؟

لیکن ایک واقعہ میرے مشاہدہ میں ایسا ہی آگیا جس سے متاثر ہو کر میں نے غلاموں کو آزاد کرانے اور بردہ فروشی کے انسداد کرنے والے قوانین کو "انسانیت" کا ایک اہم جزو تسلیم کرلیا۔ میری قریبی بزرگ عزیزہ نے ایک فاقہ کش، مفلوک الحال اور مصیبت زدہ ماں سے اسکی ۵، ۶ سال کی بچی ایک روپیہ نقد اور دس سیر جو (اناج) پر خریدی تھی، جسکی ذات غالباً چمار تھی۔ یہ نہ پوچھیئے کہ جدا ہوتے وقت ماں اور بچی پر کیسی کیسی کیفیتیں گذریں، اور ماں نے کس طرح بچی کو گلے لگا کر، اپنی ماتا اور بچی کی دلدوز ہچکیوں کو خون کے آنسوؤں سے دھویا اور پتھر کا دل بنا کے زمین پر لوٹتی ہوئی بچی کو چھوڑ کر پیٹھ پھیر لی۔

اس سے زیادہ نہیں تو کچھ کم بھی نہیں وہ واقعہ تھا جبکہ وہ بچی جس کا نام چنبلیا تھا ۹ سال کی ہو کر ایک دن ہمارے گھر میں روتی بلکتی اور داہنے ہاتھ کو دباتی سہلاتی ہوئی آئی اور آتے ہی فرش زمین پر لیٹ گئی۔ اس کی چیخ و پکار سنکر ہم سب اوس کے گرد جمع ہو گئے دیکھا تو اوسکی داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر کوئی دو انچہ کے قطر میں ایک چھالہ پڑا ہوا تھا جو جل جانے سے ہونا چاہیئے تھا۔ بڑی مشکل سے سانس روک روک کر اس نے کہا کہ بی بی نے کنوئیں سے ایک لوٹا تازہ پانی لانے کو کہا تھا۔ ساتھ ہی بڑی بٹیا نے خلوت سے ایک مرتبہ قلمدان منگوایا اور دوسری مرتبہ تپڑی پر رکھی ہوئی کتاب، ایک کتاب لائی تو واپس کر کے دوسری منگوائی، پھر تیسری، اس میں دیر ہو گئی۔ بی بی نے اس قصور پر کہ پانی جلد کیوں نہیں لائی، ایک انگارہ اوس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اسکی حالت دیکھکر دادی اماں کی اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے!

دادی اماں نے کچھ دوا لگا کر اُسے میرے کمرے میں بھیجدیا۔ میں نے اُسے کچھ کھلا پلا کے ایک کھٹولہ پر سُلا دیا۔ رات کو جب میں خود سونے کے لئے کمرہ میں گئی تو وہ جاگ گئی۔ میں نے سوچا کہ اسکو آزاد تو میں کرا نہیں سکتی، عزیزداری کا معاملہ ہے، میری حیثیت ایک لڑکی سی ہے۔ میری کیا مجال کہ ممانی سے (گو دُور کے رشتہ سے ممانی ہوتی تھیں) اس بیچاری لونڈی کو آزاد کر کے ثواب دارین حاصل کرنے کی تلقین کروں؟ لیکن میں نے اسکو آزادی دلانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ چنانچہ رات ہی میں میں نے اسکو صبح ہونے سے پہلے گھر سے کہیں دُور چلے جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن اس کا جواب سنکر میں ششدر رہ جاتی۔

وہ کہتی:۔ "منجھلی بہن! آپ کے گائے بیل جب کھونٹے سے کھول کر کھیت جوتنے یا چرنے کو بھیجے جاتے ہیں تو وہ شام کو اپنے آپ سیدھے آپ کے گھر چلے آتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھاگ کر کہیں بھی جا سکتے ہیں، مگر نہیں جاتے! کیوں نہیں جاتے؟ وہ سوچتے ہیں کہ چھت والا مکان، کھانے کو بھوسہ، گڑ یا نمک پینے کو کنوئیں کا صاف تازہ پانی، کہاں ملے گا، کون دے گا؟ یہی حال میرا ہے کہاں جاؤں، کس کے گھر میں گھس جاؤں، کون مجھے کھانا پینا دے گا؟" لیکن بحث حجت کر کے میں نے اُسے یہ آبادی، اسکی مالکہ کا مکان اور یہ دیار چھوڑ دینے پر آمادہ کرلیا، میری ہم عمر تو تھی ہی۔ اپنے دو جوڑے کپڑے اور میرے پاس جو بارہ آنے پیسے تھے، اوسکو دے دیے، اور وہ فجر کی اذان ہونے سے پہلے ہی "خدا کی حفاظت و امان" میں خدا جانے کہاں چلی گئی۔

کوئی ۵ سال کے بعد وہ میرے گاؤں کے حکیم صاحب کے یہاں دوا

لینے آئی، اوسکی اٹھان، رنگ کی صفائی، چھینٹ کا پائجامہ، پھولور کا دوپٹہ، کانوں میں چاندی کی بالیاں، گردن میں بھاری ہنسلی دیکھکر، ہم نے اُسے پہچانا نہیں، وہ خود مجھ سے لپٹ کر کہنے لگی "منجھلی بہن! میں وہی چنبلیا ہوں جسکو آپ نے خدا کی امان میں دے دیا تھا! اب میرا نام شبراتن ہے۔ اور میرا شوہر ۴ بیگہ کا کاشتکار ہے۔ میری سسرال میں بس ایک چھوٹی عمر کی نند ہے! اللہ میاں آپ کو اس احسان کا بدلہ دونوں جہان میں دیں گے۔

لیکن اس چھالے کا نشان اس بچاری کی ہتھیلی پر اب بھی موجود تھا۔ میں اس لئے بھی خوش تھی کہ غلام آزاد کرنے کا ثواب مجھے ضرور مل گیا ہوگا۔ گو ممانی صاحبہ نے جب یہ سن لیا کہ اوسے میں نے خدا کی حفاظت میں دیدیا تھا تو اتنی بگڑیں کہ یہی نہیں کہ میرا قصور آخری عمر تک معاف نہیں کیا بلکہ یہ فتویٰ دیتی رہیں کہ جو لڑکی اپنے بزرگوں کی راحت و آسائش میں خلل ڈالے اُسے اللہ تعالیٰ دوزخ کا کندہ بنائے گا"!

اس سے کم دلدوز ایک اور واقعہ ہوا ——— ہماری ایک لونڈی نے ہماری گڑیوں کے ٹوٹے ہوئے زیورات کے نقلی چھوٹے چھوٹے موتیوں کی ایک لڑی اپنے کانوں میں پہن لی تھی ——— عین عید کے دن ——— اس جرم کی اُسے یہ سزا دی گئی کہ رنگی ہوئی مارکین کے کپڑے بھی اتروا لئے گئے۔ اور روزمرہ کے پھٹے پرانے کپڑے پہنا دیے گئے۔ دو چار تھپڑ اور چوری کا الزام نفع میں، اسپر آپانے گھر بھر کی تنبیہ کی کہ اگر لونڈی باندیوں کے ساتھ اس طرح کا غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا تو ایک دن وہ آئے گا کہ یہ طبقہ ختم ہو جائے گا اور شہ نشین بیگمات

اور رئیس زادیوں کو کھانا اپنے ہاتھ سے پکانا ہوگا۔" خدا جانے ابا میاں نے کس ساعت یہ پیشن گوئی کی تھی کہ سچ مچ آج ہمارے خاندان میں (جس میں ۸۰ گھرانے ہیں) ایک بھی لونڈی موجود نہیں ہے۔ غلام زادوں نے "پٹھان" یا "مرزا" بن کر چھوٹی موٹی دوکانیں یا چپراسی گیری کی نوکریاں کرلیں۔ اور ان کی لڑکیوں اور بہوؤں نے ہاتھ سے کپڑے کی سلائی، یا کباب کی پھیری، یا چرخہ کاتنے لگیں — اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ شرفاء اور زمینداروں کی لڑکیوں کو طرح طرح کے کھانے پکانے کا، اور کپڑے تراشنے کا سلیقہ آگیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ گھر کا کام کاج کرنے سے ہماری صحت بھی اچھی ہوگئی۔

اور ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوا کہ چھوت چھات دور کرنے کا جو مشن مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۴ء کے بعد سے شروع کیا وہ ہمارے گھرانوں میں اپنے آپ ۱۹۰۱ء سے جاری ہوگئی۔ جس گھر سے لونڈیاں، باندیاں غائب ہوگئیں، اس کے اعلیٰ رکن خاندان نے چماروں کے نابالغ لڑکوں کو نوکر رکھ کر کام لینا شروع کردیا۔ مولویوں سے فتوی منگائے گئے، انھوں نے لکھا کہ اگر چماروں کا ہاتھ اچھی طرح دھلوا کر پاک کر دیا جائے تو ان کے ہاتھ کا پانی پینا بھی جائز ہوگا۔ خشک چیزوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ قدرتی انقلاب تھا کہ جس قوم کی بچیوں کو ایک ایک دو دو روپے پر خرید کر لونڈی بنایا جاتا تھا، اسی قوم کے بچے اب دو دو بلکہ دس دس روپیہ ماہانہ تنخواہیں لے کر یہاں لوگوں کے کام کرتے ہیں۔ اور اب تو خاتمۂ زمینداری کے بعد پوزیشن بالکل برعکس ہوگئی ہے، زمیندار اب محتاج و محکوم ہوگئے ہیں، اور چمار حکمراں بن گئے ہیں۔

گاندھی جی کا دوسرا مشن تھا ہندو مسلم اتحاد! خلافت کمیٹی اور کانگریس

کے اتحاد نے ۱۹۱۹ء میں ملک کی کایا پلٹ کردی تھی۔ اوس زمانہ میں بچہ بچہ کی زبان پر
مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، پنڈت نہرو (موتی لال جی) ڈاکٹر انصاری وغیرہ
زعماء ملک و ملت کے نام چڑھے ہوئے تھے۔ لیکن ہمارے گاؤں اور خاندان میں یہ چیز
پہلے سے موجود تھی۔ بہت پہلے سے! خود میرے دادا اور والد کے دوستوں میں سیکڑوں
راجپوت، چھتری، کایستھ، مارواری اور بقال موجود تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میرے والد کے ماموں، ہمارے یہاں مہمان آئے
دوسرے دن ان کے کپڑے باہر سے زنانہ مکان میں یہ کہہ کر آئے کہ ان کو طاہر
کردیا جائے۔ میں ہوش سنبھال چکی تھی، سفید کپڑے نہایت صاف شفاف دھلے
ہوئے، مناسب کلپ اور بہترین استری کئے ہوئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر
ان کو طاہر کس طرح کیا جائے گا، ان میں کس چیز کی کمی رہ گئی ہے، جو زنانخانہ میں
بھیجکر عورتوں سے کمی پوری کرائی جائے گی، میں نے دادی اماں سے سوال کیا کہ
میں ان کپڑوں میں کیا چیز لگادوں جو پہننے کے قابل ہوجائیں! اگر عطر لگانا ہے تو شیشی
باہر بھجد یجئے۔ دادا میاں خود لگالیں!" اس سوال پر دادی اماں مسکرادیں اور
کہنے لگیں "بیٹی یہ نظام آباد کے لوگ ہندو دھوبیا کے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑوں
میں اس وقت تک نماز نہیں پڑھتے جب تک کوئی مسلمان ان کپڑوں پر تین مرتبہ پانی
نہ بہادے۔ اسی کو طاہر کرنا کہتے ہیں۔ جاؤ لوٹے میں پانی لے آؤ۔ میں طاہر کردوں
گی، تم دیکھتی رہنا، پھر کبھی ایسا موقع آئے تو یہی عمل کردینا۔

یہ سنکر میں محو حیرت رہ گئی۔ اور اپنے سے بار بار سوال کرتی رہی کہ میرے
خاندان کے جو مرد نماز کے پابند ہیں، کیا ان کی تمام نمازیں رائگاں جاتی ہیں؟ مذہبی
نقطۂ نظر سے میں کچھ سوچ سکتی تھی اور نہ بحث کرسکتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی ان

بزرگوں کے مذہبی جذبہ کی قدر بھی کرنے لگتی۔ اس خیالی الجھن کو میں نے یہ کہہ کر رفع کیا کہ اتنی مغائرت سماجی بلکہ ایک حدتک قومی یگانگت کو کافی ٹھیس پہونچائے گی، بلکہ ممکن ہے کہ کسی فرقے کے جذبات کو مجروح بھی کرتی ہو۔ پھر خود ہی جواب دے لیتی کہ شاید چھوت چھات پر سختی سے عمل کرنے والوں کا جواب اہل نظام آباد اس طرح دیتے ہوں۔ لیکن ایک غلطی کا جواب دوسری غلطی سے کیوں دیا جائے؟ آخر میں فیصلہ کیا گیا کہ وقت آنے پر اس کا ردّعمل خود بخود ہو جائے گا۔ اپنی ذات سے میں نے یہ کیا کہ شادی بیاہ کے موقع پر ابا سے اصرار کر کے ان کے ہندو دوستوں کی خواتین کو بھی دعوتی نوید بھجواتی۔ اور نائنوں کے ذریعے سے براہ راست ان کو ان تقریبات میں شریک ہونے کی تکلیف دیتی۔ جب وہ آجاتیں تو میں بھی پورے گھر بلکہ خاندان کی نمایندگی کر کے اون سے مختلف مسائل و موضوعات پر باتیں کرتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ رخصت ہونے کے بعد وہ مجھ ہی کو چٹھیاں لکھتیں یا موسمی چیزیں بطور تحفہ تحائف کے بھیجتیں۔ پہلی ہی ملاقات میں میں نے بزرگ خواتین کو خالہ، بیٹیوں کو بہن اور بہوؤں کو بھابی کہہ کر مخاطب کیا۔ اور یہی رشتۂ تخاطب عرصہ تک قائم رہا۔ میری بڑی ہمشیر کی شادی پر وہ سب خواتین آئیں، مردوں نے باہر نوید دیے، اور عورتوں نے اندر دولھا کو سلامی دی۔ ان سب کے کھانے پینے کی چیزیں خاص حلوائی سے تیار کرائی گئیں۔ اور گاؤں کی ایک پنڈتانی نے عورتوں کو پوری، ترکاری، دہی مٹھائیاں کھلائیں۔ وداع کرانے کے لئے جب دولھا آیا تو میں نے ہندو بھابیوں کو خصوصیت سے مدعو کیا۔ تو ان سب نے دولہہ سے ہولی کی طرح ہمارے ساتھ مل کر رنگ کھیلا۔ اور وہاں کے لادے بھرے ہوئے گیندوں سے گیند بازی کی۔ شام کو اون سب

کو چائے پارٹی دی گئی جس کا انتظام ایک کایستھ خاندان کے تحصیلدار کی بہو کے ذمہ کیا گیا تھا
بدقسمتی سے مجھے ان لوگوں کے گھر جانے کی اجازت نہیں ملی. کیونکہ خاندانی روایات
کے مطابق کنواری بیٹیاں غیروں کے گھر نہیں جا سکتیں. غیر تو خیر غیر ہیں. اپنے
خاندان کے اُن گھروں میں بھی نہیں جانے پاتی تھیں جہاں نوجوان کنوارے ہوں. البتہ
شادی کے بعد جب میں اپنے خسر کے ساتھ پڈرانہ ریاست گئی تورانی صاحبہ کے
یہاں آمد و رفت شروع ہو گئی. اس کے بعد ماڑواری مالکان شوگر ملز کی مستورات ہمارے
یہاں آئیں اور میں چونکہ آزاد ہو چکی تھی، حالانکہ شادی کے بندھنوں میں جکڑ دی گئی تھی،
اس لئے میں بھی ان بہنوں سے ملنے ان کے گھر جانے لگی. اول تو ان لوگوں میں
بھی پردہ تھا اور بڑا سخت پردہ پھر بھی ہمارے گھر کا پردہ دیکھ کر وہ لوگ اپنے مردوں
کو حتیٰ کہ جوان نوکروں تک کو، ہماری موجودگی میں گھر کے اندر آنے سے منع کر دیتی
تھیں. یہ ماڑواری سیٹھانیاں ہم مسلم خواتین کے ساتھ ایک ہی میز پر چائے بسکٹ
بلکہ کھانا تک کھا لیتی تھیں. البتہ ہر عورت کے حصے کی تھال الگ الگ ہوتی تھی،
اور مسلمان بیویاں ایک طرف بیٹھتی تھیں اور ہندو دیویاں دوسری طرف. بالکل یہی
طریقہ مردوں میں بھی رائج تھا. یہ ہندو مسلم اتحاد نہ تو سیاسی تھا اور نہ مصنوعی، بالکل
مخلصانہ، قطعی مجلسی و معاشرتی، اور کلیتہً بزرگوں کا تخلیق کردہ تھا. یہ تو صحیح طور پر
نہیں کہہ سکتی کہ کب سے تھا. ہاں یہ کہہ سکتی ہوں کہ کس سن عیسوی تک تھا اور کیوں
پائمال ہوا؟ اس کا جواب دینا نہیں چاہتی، کیونکہ دل دکھتا ہے اور مرے بتائے
ہوئے اسباب و علل پر دو رائیں بھی ہو سکتی ہیں. اب تو اگر ہندو مسلم اتحاد کی تاریخ
بیان کی جائے تو مورخ پر یہ مصرعہ صادق آئے گا:-

ع کہے گا باغباں رو رو، یہاں غنچہ، یہاں گل تھا

بُرا ہو اس سیاست کا جس نے ہمارے مجلسی، معاشرتی اور فرقہ وارانہ اتحاد کے شجر بارور کو خزاں دیدہ بنادیا۔ کاش پنڈت نہرو پھر اسے سیراب کرکے ہندوستان جنت نشان کو فرقہ وارانہ اتحاد کا بھی گلشن سدابہار بنادیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں ایک نکتہ اکثر نظر انداز کردیا جاتا ہے یہ ہے کہ اگرچہ برطانوی راج کی تصویر بڑی بھیانک اور گھناؤنی ہے۔ لیکن اس میں ایک بھلائی کی جھلک بھی نظر آجاتی تھی۔ چونکہ انگریز ہندو، مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں وغیرہ کا مشترک دشمن تھا، اس لئے یہ تمام فرقے مشترکہ دشمن کے مقابلے میں ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد چونکہ کوئی مشترک دشمن نہیں رہا، اس لئے یہاں کے فرقے، بلکہ سیاسی اور نیم سیاسی گروہوں کے ارکان آپس ہی میں جوتم پیزار کرنے لگے۔ گویا ان کے لئے لڑنا اتنا ہی ضروری تھا، جتنا کھانا، پینا یا ہوا۔ مشترک دشمن نہ سہی، آپس ہی میں سہی، لڑنا ضروری جو ٹھہرا۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ میرے بہنوئی (مولانا قطب الدین صدیقی ایڈیٹر روزنامہ کانگریس وخلافت) شادی کی مقررہ تاریخ سے ۱۱ دن پہلے جب جیل بھیج دیے گئے تو ہم پردہ نشین خواتین کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف غصہ کے ساتھ ہی ساتھ نفرت کے جذبات بھی جاگزیں ہو گئے۔ میں نے سیاسیات کی جو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تھی اُن سے عملی کام لینے کا جذبہ صدیقی صاحب کی قید سے ہی محرک ہوا۔ اور میں نے اپنی بساط کے مطابق خلافت اور سوراج فنڈ میں چندے دے کر دوسری خواتین سے بھی چندے بھجوائے۔ اور تو کوئی کام نہ ہو سکا۔ عورتوں کو ملک وقوم کی صورت

حال کھا گراون سے بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ، اور ہاتھ کے کتے بنے کپڑے استعمال کرنے کا حلف لیا۔ ہمارے ضلع میں جنکاروں کی تعداد بہت کافی ہے۔ صرف ایک قصبہ مئو (ناٹ بھنجن) میں ایک لاکھ کرگھیں چلتی ہیں۔ اور مبارک پور میں تقریباً دس ہزار۔ اس لئے کھادی کی فراہمی بہت آسان تھی۔ گرمیوں کے زمانے میں بھی اطلس و کمخواب، تن زیب و چکن پہننے والی بیویوں نے کھدر کے موٹے کپڑے رنگ رنگ کے پہننے شروع کر دیے۔ مرد تو بلا استثناء (سوائے سرکاری ملازمین کے) کھدر پوش ہو ہی گئے۔ اس طرح کھدر پوشی بھی فرقہ وارانہ اتحاد و یگانگت کی علامت بن گئی تھی۔ مگر اب! وہ جسم نازک، جو کھادی برداشت کر لیتے تھے، آزادی کے بعد سے موٹی وائل سے چھلنے لگے ہیں۔ ایک بات یہ بھی تو ہے کہ جب مردوں نے کھادی پہننے کو ترک کر دیا ہے، تو بیچاری عورتیں کیوں نہ جارجٹ اور جسم نمایاں کرنے والے باریک کپڑے استعمال کریں۔ مجھے تو ایسے کانگریسی نیتاؤں کے نام معلوم ہیں جنھوں نے کانگریس کا اگزیکیٹو ممبر بننے کی خاطر دو جوڑے کپڑے شدھ کھدر کے بنوا لئے ہیں جن کو پہن کر کانگریس کی میٹنگوں میں شریک ہوتے ہیں۔ جلسہ کے بعد گھر آ کر کھادی کے کپڑوں کو بڑی احتیاط سے اس طرح تہہ کرتے ہیں کہ شکن پر شکن آئے، اور تہہ کی موڑ پر تہہ آئے، سوٹ کیس میں بند کر دیتے ہیں ان نام نہاد "عادی کھدر پوش" اصحاب سے تو وہ اچھے جنھوں نے کھادی کو اپنے سیاسی عقیدہ کا کبھی اہم جزو ہی نہیں سمجھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کمیونسٹ حضرات، جن کو مذہب پر اعتقاد ہی نہیں ہے وہ ان نام نہاد "مذہبیوں" سے بدرجہا بہتر ہیں جنھوں نے مذہب کو ایک کھلونا بنا لیا ہے اور ہر قابل اعتراض بلکہ اخلاق سے گرے ہوئے فعل کو

مذہبی رنگ دے کر اُوسے جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم ہندوستانی خواتین کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ وہ اُن رسوم و مفروضات کو ترک کرنا نہیں چاہتیں جن کو ملاؤں نے اصل مذہب یا اساس اسلام قرار دے دیا ہے۔ بہتیری خواتین ان رسوم کو غیر مذہبی اور لغو بھی تو ہیں مگر ڈرتی ہیں کہ "بزرگان ملت" کہیں ان کو دہریہ، مشرکہ اور جہنمی قرار دے کر اون کا مقاطعہ نہ کرادیں۔ یہی غلط خوف ہے جو پڑھی لکھی خواتین کو بھی بیگم مولانا حسرت موہانی مرحومہ کے نقش قدم پر چلنے نہیں دیتا۔ بیگم صاحبہ مرحومہ صحیح معنے میں اپنے شوہر مولانا حسرت موہانی کی رفیقۂ حیات تھیں۔ ان کی حاضر دماغی، جرارت نسوانی، بے خوفی اور خود اعتمادی جن سے کام لے کر انھوں نے تلاشی لینے والی پولس کے چھکے چھوڑ دیے پہلے تو انھوں نے وارنٹ تلاشی پڑھ کر یہ کہا کہ "یہ مکان میرا ہے، حسرت موہانی کا جو مکان ہو اوسکی تلاشی لو۔" جب پولس نے مکان کا نمبر اور بیگم صاحبہ کا نام ڈال کر مکان کی تلاشی لینے کو کہا، تو بیگم صاحبہ نے فرمایا "پہلے تم سب اپنی جامہ تلاشی دو" یہ کہکر انھوں نے چادریں، مولانا کی لنگیاں اور بڑے دستر خوان پھینک دیے کر اپنی وردیاں اتار کر ان کپڑوں کو پہن لو۔ پولس والوں نے یہ بھی کیا۔ جب تلاشی ختم ہونے کے قریب آئی، تو بیگم صاحبہ نے ان کو تنبہ کیا۔

"خبردار اس صندوقچی کو نہ کھولنا، ورنہ اگر اس میں رکھے ہوئے بم سے کوئی ہلاک ہوجائے تو میرا ذمہ نہیں۔"

یہ سنکر پولس والے حواس باختہ ہوگئے۔ ایک لمبی سی چھڑی میں اس کے ڈھکن کا کنڈہ پہنا کر دو کانسٹبل لکڑی کے سہارے صندوقچی اٹھا کر صحن میں

لے آئے۔

اب سوال پیدا ہوا کہ اسکو کھولے کون؟

تھانیدار نے سونچ سانچ کے یہ ترکیب نکالی کہ اسی چھڑی پر کپڑے کی دھجیاں لپیٹ دی جائیں۔ اور پھر اس پر اتنی مقدار میں گوند لگا دیا جائے کہ صندوقچی کا ڈھکن اس میں لپٹ جائے۔ تب ڈھکن اوپر کو اٹھا دیا جائے، اس ترکیب سے ڈھکن کھل تو گیا۔ مگر اس کے اندر رکھی ہوئی چیزیں کیونکر نکالی اور دیکھی جائیں؟

جب دن ڈوبنے لگا تو بیگم صاحبہ نے خود صندوقچی کے اندر سے چند شیشیاں اور پڑیاں نکال کر زمین پر پھینک دیں۔ اور ہنستے ہوئے کہا:۔ "احمقو! ان میں کپڑے رنگنے کے رنگ (سفوف) ہیں۔ اب جاؤ۔ مگر میری چادریں واپس دے کے جاؤ۔"

ہے کوئی مسلم خاتون جو بیگم سوہانی ثانی کہی جاسکے؟

اللہ مرحومہ کی قبر کو اپنے نور سے بھر دے۔ بیگم صاحبہ مرحومہ نے کانپور کے اجلاس کانگریس کے دوران پنڈت جواہر لال نہرو کو، جو گھوڑے پر سوار رضاکاروں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ایک بید ماری تھی، جو خیر سے ان کے گھوڑے کو لگی۔ —— کیونکہ اجمیر کے نمائندوں کو کانگریسی رضاکاروں نے اندر جانے سے روکا تھا۔ اور اس طرح روکا تھا کہ ان کی لاٹھیوں کے ضربات سے شری سیٹھی (جو اجمیر کے بڑے مشہور کارکن اور لیڈر تھے) زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے

تھے! میں نے بیگم صاحبہ کی تقلید میں اپنے ایک پٹواری کو زجر و توبیخ تو کی تھی مگر جب تحصیلدار نے پٹواری کی حمایت میں مجھ سے سوالات کئے تو میں بیگم حسرت موہانی کے بدلے گاؤں کی ایک ڈرپوک و بے زبان پردہ نشین خاتون بن گئی! تحصیلدار کے واپس جانے کے بعد سے البتہ میں خدا سے دعا کرتی رہتی ہوں کہ بیگم حسرت جیسی ہمت مردانہ مجھے بھی عطا کر دے۔

عصمت چغتائی

سمجھ میں نہیں آتا اپنے متاثر ہونے کا الزام کس کے سر تھوپ دوں۔ ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں۔ نگوڑے شیخ پتلی دال کے کھانے والے۔ مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال والوں پر پڑی ہوں۔ وہی اپنی پھوپی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی میری اماں سے پوچھتا کہ بٹی کو کیا ہو گیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں "نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال کا، یہ سب نصیب کا پھیر ہے۔"

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہو گی۔

مگر مجھے بذاتِ خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر پچر بچوں کے جمِ غفیر میں ایک پاپیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ کبھی خود کو کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لئے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انھیں کے ساتھ گلی ڈنڈا فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گذرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھئے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے۔ جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے ڈوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھیڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامزاق اور باتونی، آپس میں پھبتیں چلتیں نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر سان رکھی جاتی۔

ابا پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال

اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجۂ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور ان گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جائیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے بجّوں پر قلانچیں بھرتا دیکھکر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔"

"نوج بوا، ننھّو کی لونڈیا ہے کہ موا بجار توبہ توبہ۔"

اور میری اماں جان نصرت خانم جنھیں لوگ پیار میں ننھّو کہتے تھے شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی ان مرزہ گلیوں میں پہلی بار۔ مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت تھی، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں۔ اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں۔ گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں۔ اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں۔ مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں، ان گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ جن سے اماں لرزا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے۔ اپنے کنبہ میں آکر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پرزہ

ہیں۔ چھپ کر وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الہٰی توبہ۔ بڑھیوں کو چنکیوں میں اُلّو بناکر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہیت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا۔ اور ہم لوگ علی گڈھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی کچھ خاندان والوں سے وحشت سی ہوتی تھی۔ علی گڈھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈی ہیوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت، اور ان کھیتوں میں ککڑیاں کھیرے چرانا۔ پیڑوں پر چڑھنا، اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے۔ مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے، اور نہ ان کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں۔ مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ عموماً سزا نہیں ملتی، الٹے ڈانٹ دیے جاتے۔

علی گڈھ آکر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انھیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے۔ ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چپتیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انھوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ

ابتدا کیسے ہوئی۔ مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرتے اِملا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کا ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی، اور اسی زمانہ سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں کہانیاں پڑھا کرتی۔ مگر اس زمانے میں میں نے جتنی ناولیں پڑھیں خاک پلے نہیں پڑا لہٰذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل اُن کی آواز بازگشت بن گئی۔

"منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے" جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں، اور عظیم بھائی نے بھی میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے بڑی ہشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انھوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور

ضدی تھی ان کی شہ پاکر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے، اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹہ پڑھایا کرتے۔ کبھی انھیں حرارت ہوتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی بیٹی ان کی چھاتی سینکا کرتیں۔ اور وہ مجھے پڑھایا کرتے، انھوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ بڑے بھائی جو تھے اس لئے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے اور چند صفحہ کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

"ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ اتنا تو کھانستے ہیں۔" میں نے جل کر کہا۔

"بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔" انھوں نے ہنس کر کہا، اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انھیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اسقدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے، چھٹیوں میں انھوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا، چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انھوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر

لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب امتیاز، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے، اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کئے۔

مثلاً میں بہت خوب صورت ہوں، بالکل حجاب امتیاز کی ہیروئن کی طرح سنہری بال نیلی آنکھیں .... قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دراز ہوں، ہیرو آتا ہے ..... میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا، شاید اس لئے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آ کر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار وقطار روتا، بے تابانہ مجھے چومتا، اور میری حسین موت پر ڈاڑھیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انھیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے۔ جیسے رومانی ناول میں جب ہیرو ہیروئن کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے تو پڑھنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال لکھنے میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا، وہ "گندی" ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتہ کاری ہوگی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ سہ بارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہیں۔ اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا روزنامچہ تھیں بلکہ وہ اُن کہانیوں کا نچوڑ تھیں، جو

سب مجھے بتا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہو گیا۔ اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کا غذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے۔

"آہاہا.... بھتنی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ"

شمیم سور نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا....

"ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور میرے گلابی ہونٹ....."

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی، سر میں بیسن ڈال چکی تھی، اُفوہ بیان نہیں کر سکتی کیا حالت ہوئی.... یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ ہی سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا۔ اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارا کاغذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منھ نوچ ڈالا۔ وہ بے چارا خونق منھ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اُسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، میں نے اُسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت بکنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا

کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارا بڑے درجہ کا چھوٹا مشہور تھا۔ اس لئے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب بھی اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آجاتی، بس اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اول تو ایسی بے ہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں۔ جو اگر لکھیں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہ تھا سوائے اوپری چوما چاٹی کے جو مجھے نہایت بھس بھسی لگنے لگی تھی۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی، اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد چار سال میں نے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈرامہ ہیثن پلے اور شکسپیر سے لیکر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ "فسادی" برنارڈ شاہ سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا مواد میں نے اپنے ارد گرد سے لیا۔ اور رایٹ گار ابرنارڈ شا سے سیکھا۔ بی، ٹی کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی۔ اس لئے میں نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجہ سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا ایک دفعہ مل کر کھنچا نہ جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انھیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔

بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ گڑگڑاتے جاڑے میں بوبیاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈانٹے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں اور رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھونگریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انھوں نے سامنے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں، اُن کے کٹے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کی بلاؤز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر۔ مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم خاردار نہیں تھی۔ کیونکہ تقریر کے بعد انھیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بے باکی کا تہلکہ مچ گیا تھا۔ اور میں نے بے سمجھے بوجھے اُن کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر چن لیا تھا۔

۳۸ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب انکی سلگتی ہوئی باتیں تپنے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ ہیرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگ مرمر کے سارے بت منہدم کر دیے۔

زندگی ننگی جھم سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اُن سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا جی چاہتا انھیں کھا جاؤں، کیا کروں، جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں انھیں اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا ہی کو اٹھا کر افسانوں کے طاقچہ میں بٹھا دیا۔ کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی

ہوسکتی تھیں۔ مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا۔ ان کی بھرپور سیمابی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور کہی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ،

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں، اور کیا لکھیں؟ کے مخمصہ میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے، اور پرانے بچھڑ گئے۔ اور پھر

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انجمن کے پرخچے اڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں

اٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہوگیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لئے لکھ کر روزی نہیں کمائی جاسکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کے لئے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بے باکی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہئے جو چھپر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں تجربہ سُنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا۔ "دھانی بانکیں" اور جڑیں سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی۔ مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور کی قلا نگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں، ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انھیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں اُن پر فتح پائی جا سکتی ہے۔ والدین ٹریفک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے، "یہ نہ کرو"، "وہ نہ کرو"۔ اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا۔ لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انھیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں اُن سے ملنے جودھپور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضہ میں تھا۔

میں پہونچی تو دھنڈھار اجڑے ہوئے کمرے میں میری اماں بیٹھی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انھوں نے محبت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانہ میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پُرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے تھے، لڑائیاں ہوتی تھیں، ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا، اس اکیلے پن کو دیکھا۔ موٹے تازے دس بچے پیدا کر کے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان اُبل آیا۔ ماتا جاگ اٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا۔ اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا، جو دنیا کو بساتی ہیں۔ مر مر کر جنم دیتی ہیں، انھیں پالتی پوستی ہیں، جو کچھ ان پر نچھاور کرتی ہیں نہ اُن سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کرے تو فرمانبردار ہے جو اپنے بال بچوں کے خرچہ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا، جو میری اپنی اماں سے ملاقات ہو گئی اور

کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اُٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مردہ خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے نئے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی تیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے، ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے۔۔۔۔ کائی چھٹ جاتی ہے۔۔۔۔۔ جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لَو دینے لگتا ہے۔ انسان ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔

سردار جعفری

قبول بندگیم را خدائے برنمی خیزد

مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ اُن کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرشِ بریں سے وحی و الہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں۔ اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم اور افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔

انسان کے تسلسل میں حیاتیاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہینِ

منت ہے - یہ تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے - لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے - ہاتھوں کے بغیر نہ جنگ ممکن ہے نہ امن - محبت ممکن ہے نہ نفرت' یہی ہاتھ گلے میں حمائل ہوتے ہیں اور یہی ایک دوسرے کو چھوڑ کر دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتے ہیں - ساز میں سوئے ہوئے نغمے ان ہاتھوں سے ہی بیدار ہوتے ہیں - ہم آغوشی کے لئے پہلے یہی آگے بڑھتے ہیں - اور رخصت کے وقت یہی سب کے بعد پیچھے ہٹتے ہیں - یہ وصال و فراق کی حسین علامتیں ہیں - جس طرح ذہن اپنے آپ کو خیال میں تبدیل کر کے اسکو اپنے وجود سے الگ کر دیتا ہے اور وہ خیال ذہن انسانی سے بھی زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے - اسی طرح ہاتھ اپنے آپ کو قلم اور تلوار' مشین اور اوزار میں تبدیل کر کے انھیں اپنے وجود سے الگ کر دیتے ہیں اور وہ چیزیں ہاتھوں سے بھی زیادہ طاقت ور اور خلاق بن جاتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت، اور قلب انسانی کی وسعت سمجھا ہے - اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے، اس لئے جب قلم جھوٹ بولتا ہے یا چوری کرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں - میں ہر ادیب سے یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنے قلم کا احترام کرے گا کیونکہ اس کے نفس کی عزت اور شرافت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے -

میں اپنے بچپن میں ایک تختی لکھا کرتا تھا، جس پر ہزاروں بار نہیں تو سیکڑوں بار اس شعر کی مشق کی ہے -

قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

ممکن ہے کسی کے لئے یہ دولت چاندی سونا ہو، کیونکہ دنیا میں ضمیر فروشوں کی طرح قلم فروشوں کی بھی کمی کبھی نہیں رہی ہے۔ لیکن میرے لئے یہ علم، ہنر، خلوص اور صداقت کی دولت ہے، اور قلم کے احترام کے معنی اس دولت کا احترام ہے اور احترام کا یہ جذبہ ہی بار بار میرے قلم کو روک رہا ہے۔

کیا میرا قلم صداقت کو پیش کر سکے گا؟ صداقت کوئی سپاٹ حقیقت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا ہیرا ہے جو برابر تراشا جا رہا ہے اور زندگی اور عمل کی جلا اس میں نیا نور اور نیا رنگ پیدا کر رہی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صداقت بدل جاتی ہے۔ دراصل اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اچھے شعر اور اعلیٰ فن کی طرح صداقت تہہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے کبھی کوئی تنہا انسان، کوئی تنہا قوم، کوئی تنہا نسل، اس کا احاطہ نہیں کر سکی ہے۔ اور نہ کوئی تنہا نظریہ اس پر حاوی ہو سکا ہے۔ ناتمامی اسکی خصوصیت رہی ہے، اور اس ناتمامی میں بلا کا حسن ہے۔

اس سے بھی زیادہ مشکل اس صداقت کا پیش کرنا ہے جس کا تعلق اپنی ذات سے ہو۔ انسان اپنے دل سے جتنے جھوٹ بولتا ہے اتنے جھوٹ دنیا کے سامنے نہیں بولتا اور اپنے جھوٹ کو سچ کی جھلک دینے کے لئے وہ کبھی جادوگری سے کام لیتا ہے اور کبھی فریب کاری سے۔ دنیا سے جھوٹ بولنے کے لئے پہلے اپنے دل سے جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ اس لئے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اور بھی ڈرتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں کن شخصیات اور واقعات نے متاثر کیا ہے۔

وقت کے ساتھ بیتی ہوئی یادوں کے نقوش بدل جاتے ہیں ایک نقش دوسرے نقش میں مل جاتا ہے اور تصویریں مسخ ہو جاتی ہیں۔ تعبیروں کے بنتے

ہوئے میدان سے خوابوں کی ٹھنڈی اور سکون بخش چھاؤں دکھائی نہیں دیتی۔ اور ہم اکثر نئے خواب تخلیق کر کے انھیں پرانے خوابوں کا نام دے دیتے ہیں۔ عمر کے چوالیس سالوں میں ہزاروں دنوں اور ہزاروں راتوں کی شکنیں پڑی ہیں اور ہر شکن میں لاکھوں لمحے سو رہے ہیں۔ اُن کو جگانے کی ہمت کس میں ہے۔ قہقہوں کے مرجھائے ہوئے پھول، آنسوؤں کے جمے ہوئے موتی، ابروؤں کی ٹوٹی ہوئی کمانیں، رخساروں کی بجھی ہوئی شمعیں، کتابوں کے پھٹے ہوئے ورق، علم شعور، رشک، حسد، محبت، نفرت، حماقت، رعونت سب ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ آج یہ بتانا مشکل ہے کہ کس نے کیا سکھایا ہے، کس نے کیا اثر ڈالا ہے۔ شعوری اثرات اور غیر شعوری اثرات کے درمیان لکیر کھینچنا مشکل ہے۔

میری یادوں میں ایک کھنڈر اُبھر رہا ہے۔

کھنڈر کبھی کسی کھوئی ہوئی عظمت کا پتہ دیتے ہیں اور کبھی کسی عظمت کے بغیر بھی انحطاط کی داستان سناتے ہیں۔ ہر کھنڈر کے لئے قدیم ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسے کھنڈر بھی ملتے ہیں جن کی ہر اینٹ سلامت ہوتی ہے، ہر دروازہ کھلتا ہے، اور ہر دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ پھر بھی عمارت کو دیکھ کر اس پر کھنڈر کا گمان گذرتا ہے دیواروں پر بغیر حروف کی ایک کہانی لکھی ہوئی ہے۔ دروازے بغیر زبان کا ایک افسانہ سنا رہے ہیں اور اردگرد کی ہواؤں سے بوسیدگی کی باس آرہی ہے۔ میں جس کھنڈر کا ذکر کر رہا ہوں، وہ ایسا ہی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی دل میں ویرانگی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

بمبئی سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور شمال میں ہمالیہ کی ترائی کا دامن جہاں سے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پندرہ بیس ہزار کی آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ـــــــ ایک تعلقہ داری کی راجدھانی ـــــــ تعلقہ داری کو ریاست کہتے ہیں، اور تعلقہ دار کو مہاراجہ۔ اس قصبے کی ایک پتلی سی گرد آلود سڑک ـــــــ سڑک کے کنارے ایک اصطبل جس میں گھوڑوں کے لئے چھ تھان ہیں۔ سائیسوں کے لئے دو کوٹھریاں، اور موٹروں اور گاڑیوں کے لئے تین گراج۔ میرے بچپن میں ہر تھان پر گھوڑے بندھے، ہر کوٹھری میں سائیس، اور ہر گراج میں موٹر یا بگھی۔ اب ایک گراج میں ایک پرانا تانگا ہے اور دوسرے میں ایک بوسیدہ ٹم ٹم اور دو تھانوں پر دو مریل سے گھوڑے جنھیں دیکھ کر ان کے مالکوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اصطبل کے باقی حصے میں لینڈی کتے رہتے ہیں۔ محلے کی کتیاں بچے جنتی ہیں اور قصبے بھر کے جانور گرمی، برسات اور جاڑوں کی صعوبتوں سے بچنے کے لئے آ کر پناہ لیتے ہیں۔

اصطبل کے برابر ہاتھی کا کھلا ہوا تھان ہے۔ جہاں رام پیاری ہتھنی گنے کھایا کرتی تھی۔ جب وہ مری ہے تو اسکی لاش کلہاڑیوں سے کاٹی گئی تھی، اور گوشت اور ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اٹھائی گئی تھیں، پرانے سماجوں کا جنازہ بھی اسی شان سے نکلتا ہے۔

اور تھان کے سامنے جو تلپٹ کے ہرے پتوں اور نیلے پھولوں سے ڈھکا ہوا تالاب ہے اس کا پانی کبھی بڑا صاف شفاف تھا اور اپنی بڑی بڑی رہو مچھلیوں کے لئے مشہور تھا۔ اس کے کنارے امردوں کا ایک باغ تھا اور ایک کٹہری

پیڑ کا بوڑھا اور اسکی بیوہ میٹی امرود بیچا کرتی تھی، پکنے سے پہلے گدر امرود بک جاتے تھے۔ اب باغ اجڑ چکا ہے۔ اور ہاتھی کا تھان گھوڑے کے نیچے دب گیا ہے اور اکثر سبزی مائل نیلے کانٹے دار پودوں کے زرد زرد پھولوں میں دو چار گدھے کھڑے نظر آتے ہیں۔

تھان کے پاس لگا ہوا برگد کا بوڑھا درخت اب بھی پھلتا ہے، اور چڑیاں اس کے سرخ رنگ کے پھلوں کو کتر کتر کر زمین پر پھینکتی رہتی ہیں، اور اس کی ٹہنیوں پر لال چونچ کے طوطے ٹائیں ٹائیں کرتے رہتے ہیں۔ پریاں برگد کے پھول اب بھی چرالے جاتی ہیں، لیکن اب اس بات میں کوئی رومانی کیفیت باقی نہیں ہے۔ اس خیال میں کوئی حیرت کا لطف نہیں ہے۔ میں اپنے بچپن میں جب کبھی ان پریوں کا تصور کرتا تھا تو میری بڑی آپا اور ماں کے چہرے مسکرانے لگتے تھے اور میں اس بات کا کوئی جواب نہیں سوچ پاتا تھا کہ وہ برگد کے پھول کیوں چرالے جاتی ہیں۔ میری ماں اور بڑی آپا اب منوں خاک کے نیچے سو رہی ہیں، اور برگد کے پیڑ کی موٹی موٹی لمبی لمبی جٹائیں زمین میں اپنے لئے جڑیں تلاش کرنے شاخوں سے نیچے اتر آئی ہیں۔ بچپن کی پریاں کھوگئیں اور جن شاخوں سے پھولوں کا تصور وابستہ تھا وہ ہیبت ناک ہوگئی ہیں۔

سڑک کی دوسری طرف سرخ اینٹوں کی قدآدم دیوار کا ایک چوکور احاطہ ہے، اس کے دو کونوں پر لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے ہیں۔ جن کو کبھی سرخ بجری کی لہرائی ہوئی روش نے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا۔ اب چولوں میں اتنا زنگ لگ چکا ہے کہ پھاٹکوں کا بند کرنا مشکل ہے۔ احاطے کے اندر ایک ٹینس

کورٹ تھا اور اس کے چاروں طرف ہری ہری دوب بچھی ہوئی تھی۔ عشق پیچاں کی بیلیں باریک تاروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے لگے ہوئے تھے اور مہندی کی باڑھ کھڑی تھی، جو بجری کی لال روش کے کنارے کنارے دوڑتی تھی۔ دو کونوں پر گل مہر کے دو پیڑ تھے جو اپنے پھولوں سے لد کر لال بھبھوکا ہو جاتے تھے۔ ان سب کی حفاظت کے لئے دو مالی تھے۔ جو ذرا سی کوتاہی پر پیٹ دیے جاتے تھے۔ اگر غلطی سے اس باغ میں کوئی گائے، بیل گھس آئے تو اسے پکڑ کر میونسپلٹی کے "کانجی ہوز" میں بند کر دیا جاتا تھا اور مالیوں پر اتنی گالیاں پڑتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ میں نے اپنے بچپن میں اس باغ سے بے شمار تتلیاں پکڑی ہیں اور گل مہر کی ہری ہری کلیوں سے قاشیں نکالی ہیں۔

اب مہندی کی باڑھ، گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے، عشق پیچاں کی سُرخ پھولوں سے بھری ہوئی سبز بیلیں اور ہری ہری دوب سب سوکھ چکی ہے، باغ ایک میدان میں تبدیل ہو چکا ہے اور اب سانڈ وہاں آپس میں لڑتے ہیں۔ اور گدھے رینکتے ہیں۔ اور کھجیلے کتے اپنی پچھلی ٹانگوں میں اپنی دم دبائے ہوئے ٹہلتے رہتے ہیں۔ گل مہر کے پیڑ اب بھی ہیں لیکن وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، اور ان میں پھول نہیں آتے۔ کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی کلی جھانکتی ہے، ورنہ بس شاخوں کے سوکھے ہوئے ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوئے ہیں ـــــــ بھوکے بھکاریوں کے ہاتھوں کی طرح جنھیں کوئی بھیک نہیں دیتا۔ یہ خشک ہاتھ ٹھنڈی اور گرم ہواؤں سے خشک اور تر موسموں سے اپنی پتیوں اور پھولوں کی بھیک مانگتے مانگتے تھک جائیں گے اور پھر ایک ایک کرکے گرتے جائیں گے۔ انھوں نے شکست کھا جانے

کے بعد بھی اب تک شکست کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ انھیں یہ خبر نہیں کہ جب جڑیں سوکھ جاتی ہیں تو شاخوں میں برگ دبار نہیں آتے۔ موسم بہار بھی ان کے لئے بہار کا پیغام نہیں لائے گا۔ یہی ضد سماجی نظاموں میں تشدد کی پرورش کرتی ہے۔

احاطے کے اندر بجری کی لال روش کے موڑ پر ایک اور بڑا پھاٹک ہے اس کی محراب اتنی بلند ہے کہ اس کے نیچے سے ہاتھی گذر سکتا ہے۔ اس کے اندر اینٹوں کا بنا ہوا ایک بڑا صحن ہے۔ اور بیچ میں ایک چبوترے پر اس قصبے کا سب سے اونچا نیم کا درخت کھڑا ہوا ہے، اسکی عمر کوئی سو برس کے قریب ہوگی۔ اس کا سایہ اب بھی ٹھنڈا اور صحت بخش ہے۔ لیکن پھنگیوں پر چیلوں اور کوّوں نے گھونسلے بنالئے ہیں اور ان کی بیٹ نیم کے نیچے کسی کو نہیں بیٹھنے دیتی، پکی ہوئی خوشبودار نبولیاں سال میں ایک بار ٹپکتی ہیں۔ نیم کی ہری پتیاں سنہری ہوکر سال میں ایک بار ہواؤں میں اپنا سونا بکھیرتی ہیں، لیکن چیلوں اور کوّوں کی بیٹ بارہ مہینے ٹپکتی رہتی ہے۔

اس کے چاروں طرف کئی مکانات تھے۔ ہر مکان میں ایک گھرانہ آباد تھا۔ انھیں میں ایک میرا گھر بھی تھا۔ بڑے سے صحن، وسیع دالان اور کوٹھے کی دو کھلی ہوئی چھتوں کا گھر، اسکی پورب کی دیوار کی طرف سے ایک منڈیر کا خوب صورت کلس اور شیشم کا ایک بلند قامت درخت اندر جھانکتا تھا۔ اور پیڑ کے پیچھے سے صبح کا سورج اور چودھویں کا چاند نکلتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب پلنگ بچھ جاتے تھے تو یہ آنگن چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ اور جاڑوں کی راتوں میں اتنا لمبا کہ اکثر دوڑ کر اس آنگن سے گذرا کرتا تھا۔ اسی آنگن میں میں نے پہلی بار اپنی

رگوں میں جوانی کا خون محسوس کیا۔ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں دیوار کے سائے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کا پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اور وہ غافل سو رہی تھی۔ اور جب مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین چیز نہیں دیکھی ہے۔ وہ چہرہ آج نظروں سے اوجھل ہو کر اور زیادہ خوب صورت ہو گیا ہے۔

اس سارے ساز و سامان میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ہمارے چھوٹے سے گھر کے سوا اپنا اور کچھ نہیں تھا۔ ہر چیز ریاست کی تھی۔ جو میرے والد اور چچا کو ملازمت کے سلسلے میں استعمال کے لئے ملی تھی۔ میرے چچا بڑے عہدے پر تھے اور والد چھوٹے عہدے پر، لیکن رعب پورے خاندان کا تھا۔ چچا سید صاحب کہلاتے تھے اور والد بڑے بھیا کے نام سے مشہور تھے۔ میری ماں کو سارا قصبہ بڑی بہو کہتا تھا۔

خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے، جوان ہوتے تھے، بلرام پور کے اسکول کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔

خاندان کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں، ورنہ دن ہنسی خوشی گذر جاتا تھا۔ اور رات کو سب بہن بھائی بستروں پر لیٹ جاتے تھے۔ کوئی ایک بہن شرلک ہومز کی کہانیاں، راشد الخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی، اس سے تھک جانے کے بعد جناتوں کے قصے شروع

ہوتے جو انتہائی دلچسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے۔ میری ایک پھوپھی کو اصرار تھا کہ گھر میں جو کالا کتا آتا ہے وہ جن ہے اور انھوں نے بلّی اور گدھے میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔

یہ بڑا ایماندار، مذہب کا پابند اور پرہیزگار خاندان تھا۔ اسی لئے مجھے چھوٹی عمر میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا تھا کہ مولوی بن جاؤں گا تو خاندان کی عاقبت سُدھر جائے گی۔ لیکن طبیعت کی آزادروی نے اس سعادت سے محروم کر دیا اور میں لکھنؤ سے تین بار بھاگا۔ میرے والد اور چچا نے کبھی رشوت نہیں لی۔ اور دولت مندی کی شہرت کے باوجود صبر و قناعت کے ساتھ زندگی گذار دی۔ میری ماں کے سارے زیور بک گئے، لیکن کسی کو کانوں کان یہ خبر نہ ہوئی کہ گھر میں افلاس ہے۔ وہ بڑے خلوص سے ملازمت کرتے تھے اور ہر موقع پر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ عام طور سے کالی ٹوپیاں پہنتے تھے جو نہ جانے کیوں ایرانی ٹوپیاں کہلاتی تھیں، لیکن دسہرے کے موقع پر جو ریاست میں بڑے دھوم سے منایا جاتا تھا رنگین صافے باندھ کر جلوس کے ہاتھیوں پر بیٹھتے تھے، اور مہاراج اور مہارانی کو نذر دینے جاتے تھے۔ عید، بقرعید، ۱۳ رجب اور عیدِ غدیر بڑی شان سے مناتے تھے۔ اور دیوالی پر ریاست کے دیے ہوئے تیل کے دیوں سے گھر کی دیواریں سجاتے تھے۔ ریاست کے کام کے علاوہ ہمارے خاندان کو اخراجات کے لئے جو گاؤں ٹھیکے پر ملے تھے ان کا انتظام کرتے تھے، اور سال بھر نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے۔ شعبان کے مہینے میں بارہویں امام کا یوم ولادت مناتے تھے اور عریضے ڈالنے جاتے تھے اور محرم بڑے

جوش و خروش مناتے تھے۔ اپنے انتقال سے کچھ پہلے جب میرے والد بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ توان کی چارپائی محرم کی مجلسوں کے لئے عزاخانے میں لاکر رکھ دی جاتی تھی اور وہ لیٹے لیٹے مجلس سنتے تھے۔

چاندرات کو عورتیں چوڑیاں توڑ دیتی تھیں۔ اور زیور اتار کر رکھ دیتی تھیں اور سب لوگ کالے کپڑے پہن لیتے تھے۔ اور باہر کوٹھی کے سب سے بڑے کمرے میں ضریح رکھی جاتی تھی اور علم کھڑے کئے جاتے تھے۔ چھتوں میں جھاڑ فانوس لگائے جاتے تھے، چاندی اور سونے کے علم کے پنجے اور سنہری کام کے سبز، زرد، سرخ اور سیندوری پٹکے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو مہندی اٹھتی تھی اور مجھے علی بند پہنایا جاتا تھا۔ آٹھویں کو حضرت عباس کا علم نکلتا تھا اور شبِ عاشور عزا خانہ سجا دیا جاتا تھا اور فانوس جگمگا اُٹھتے تھے۔ قصبے اور گرد و نواح کے گاؤں کے لوگ زیارت کرنے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ عورتیں ٹولیاں بنا کر دیہاتی مرثیے گاتی ہوئی آتی تھیں، اور حضرت صغرا کے قاصد کے نام پر جوان لڑکے پیک بن کر آتے تھے۔ اُن کی کمر میں ایک پٹکے کے ساتھ ایک گھنٹا بندھا ہوتا تھا۔ سر پر پگڑیوں میں مور کے پر لگے ہوتے تھے اور ہاتھوں میں مورچھل رہتے تھے۔ پیکوں کی ٹولیاں اپنے گھنٹے بجاتی ہوئی آتیں اور عزاخانے میں مرثیے گاگا کر ناچتی تھیں۔ اُن کے قدم "حامی اللہ" کے بول پر اُٹھتے تھے۔ دس دن مسلسل مجلسیں ہوتی تھیں، اور پڑھنے کے لئے لکھنؤ سے ذاکر آتے تھے۔ عشرے کے دن سارے قصبے کی فاقہ کشائی ہمارے گھر ہوتی تھی۔

سال کے اور مہینوں میں بھی مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں جن کی بدولت

میں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے اور تمام بڑے علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیے ہیں۔ مولانا سبط حسن کی خطابت بے پناہ تھی۔ فصاحت اور بلاغت کا دریا موجیں مارتا تھا۔ اور اشاروں اور کنایوں کا تیکھاپن تڑپا دیتا تھا۔

دولھا صاحب کو میں نے اس عالم میں دیکھا کہ وہ منبر کے نیچے تقریباً دوہرے ہو کر بیٹھے تھے، دو آدمیوں نے سہارا دے کر منبر پر بٹھا دیا۔ مرثیہ انھوں نے ہاتھ میں لیا۔ ایک بار سنبھلے اور پڑھنا شروع کیا تو دوسری ہی چیز ہو گئے۔

نام مردوں کا رقم باڑھ پہ تلوار کی ہے

اس کے علاوہ انیس کے مرثیوں کا چرچا بھی تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی ہے۔ میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ سلام اور مرثیوں کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار اشعار یاد رہتے۔

شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے۔ اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے۔ ان کی زبان، بیان، تشبیہ، استعارے، ترتیب ہر چیز انیس کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔ میں ساٹھ ساٹھ، ستر ستر بند لکھ جاتا تھا، لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا ویسے مجلس میں پڑھنے کے لئے یہ بند کافی تھے۔

جب میں نے پہلا مرثیہ کہا ؎

آتا ہے کون شمعِ امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے

.... ----------

اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نورِ آفتاب کا

اور اسے منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے بہت گلے لگایا اور ماں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ میرے چچا بار بار مرثیے کے آخری دو مصرعوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

اس کامیابی سے ہمت بہت بڑھی اور میں نے پندرہ بیس دن میں ایک مرثیہ اور کہہ لیا، وہ اس طرح شروع ہوتا تھا۔ ؎

آتا ہے ابنِ فاتح خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برج زوال میں

کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

مجھے اب تک یاد ہے کہ آخری مصرعے کے قافیے کی بہت داد ملی، لیکن کچھ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ میں کسی سے لکھوا کر پڑھ دیتا ہوں۔ یہ بات مجھے اتنی

ناگوار گذری کہ میں نے نیا مرثیہ ان مصرعوں سے شروع کیا ؎

اے بلبلِ ریاضِ بیاں نغمہ بار ہو
اے نوعروسِ طبعِ جواں ہم کنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو
اے حاسدِ دریدہ دہاں شرمسار ہو

کیا اس میں مجھ سے ہیچمداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمتِ ربِّ غفور ہے

اس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ:۔

اِک خوشہ چیں ہوں باغِ جنابِ انیس کا

پھر ایک اور مرثیہ کہا جس کے صرف دو مصرعے یاد رہ گئے ہیں ؎

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

یہ مرثیے اب تک بلرام پور میں محفوظ ہیں۔ اور محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔

کربلا کے قافلے میں مجھے امام حسین کے بعد سب سے زیادہ عقیدت حضرت عباس اور حضرت زینب سے تھی، اور انیس کے مرثیوں نے اس عقیدت پر جلا کردی تھی۔

میرے والد کے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ قرآن بچپن میں بہار کے ایک مولوی صاحب سے پڑھا تھا۔ وہ دن میں بید دس بے مارتے تھے، اور

رات میں پیغمبروں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ والد کی کتابوں سے میں نے تمام پیغمبروں اور چودہ معصومین کے حالات پڑھ لئے تھے۔ اور چونکہ میں اس عمر میں مرثیہ خوانی کے علاوہ حدیث خوانی بھی کرنے لگا تھا اس لئے وہ حالات اور قرآن کی بہت سی آیتیں زبانی یاد تھیں۔ اور ان سب کا مجموعی اثر مجھ پر یہ تھا کہ حق اور صداقت کے لئے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں نے حق اور صداقت کو ہمیشہ زمین کی چیز سمجھا۔ نمرود و خلیل کی داستان سے لے کر شہادتِ حسین تک کے واقعات نے میرے خون میں حرارت پیدا کردی تھی اور میں اقبال کے یہ اشعار لہک لہک کر پڑھا کرتا تھا:۔

آن امام عاشقان پور بتول
سرو آزادے ز بستانِ رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیِ ذبحِ عظیم آمد پسر
دشمنان چون ریگِ صحرا لا تعد
دوستان با لفظ یزدان ہم عدد
رمزِ قرآن از حسین آموختیم
ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
این دو قوت از حیات آمد پدید
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت

سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

اس زمانے میں چند سوالات نے مجھے بے چین کیا اور چند واقعات نے میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دنیا کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ لیکن اس سوال نے ہمیشہ بے چین رکھا کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے۔ اور اس کی ابتدا میرے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔

میں نے ایشیائی افلاس کے بدترین نمونے دیکھے ہیں، ریاست کے گاؤں میں پہلے اور اپنے گھر میں بعد کو، مجھے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بے انتہا شوق تھا، اور میں بندوق لئے گاؤں گاؤں اور جنگل جنگل مارا پھرتا تھا اور ریاست کی تحصیلوں اور ذیلداریوں میں ٹھہرتا تھا۔ اس طرح میں اودھ کے دیہات کی زندگی سے آشنا ہوا۔ یہ خوب صورت گیہوں، دھان اور گیہوں کے کھیتوں اور انتہائی افلاس کی سرزمین ہے۔ اس میں اتنی گنڈ ندیاں نہیں ہوں گی جتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں جذب ہو چکے ہیں۔ میری یاد میں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں، گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کی پیٹھوں پر اینٹیں لدی ہوئی ہیں، ان کے جوتے مارے جا رہے ہیں، اور وہ دہائیاں دے رہے ہیں، پیڑوں کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں، پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں کے بچے۔ بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں، ایک بار میرے سامنے ایک کسان عورت ننگی کر دی گئی۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار تصویریں ہیں

اُن کا تیل خریدا اور اس یقین کے ساتھ سر میں لگایا کہ ابکی ہر لوبند سے دماغ اس طرح روشن ہو جائے گا جیسے مٹی کے تیل سے لالٹین جل اٹھتی ہے۔ لیکن صبح روشنی دماغی کے سلسلے میں اپنی ماں کا یہ فقرہ سنا کہ یہ چھچھوندر کی بو کہاں سے آرہی ہے۔

آج منشی بدری پرشاد کا خیال آتا ہے تو مجھے ان پر بے انتہا پیار آنے لگتا ہے حالاں کہ بچپن میں اُن کے بید کھا کر میں نے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح درختوں کے پیچھے چھپ کر اُن پر آوازیں لگائی ہیں۔ لیکن منشی جی نے کبھی لڑکوں کے فقروں پر مڑ کر نہیں دیکھا۔ گردن جھکائے آتے تھے اور گردن جھکائے چلے جاتے تھے۔ میں کبھی ان کے گھر نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی زندگی میں کیسی کیسی ناکامیاں اور حسرتیں تھیں۔ شاید خواہشوں کا گلا وہ بہت پہلے گھونٹ چکے ہوں گے اور تیل صرف اس لئے بیچتے ہوں گے کہ اُن کی قلیل سی تنخواہ ان کے لئے ناکافی ہوگی اور ان کی دال گھی سے محروم رہتی ہوگی۔ اب اگر مجھے منشی بدری پرشاد مل جائیں تو میں ان کے پیر چھو کر اپنی گستاخیوں کی معافی مانگوں جن کا غالباً انھیں علم بھی نہ ہوگا۔ اور ان کی تیل کی شیشیاں خریدنے کے لئے تمام عمر اُن سے بید کھاتا رہوں اور اُف بھی نہ کروں۔

ایک میر تقی جوں جوں تھے جن کے ہاتھ پیر کو لقوے نے بیکار کر دیا تھا۔ لوگ انھیں جوتی چپت کہہ کر چڑھاتے تھے۔ اُن کا منھ کالا کیا گیا، انھیں گدھے پر بٹھایا گیا اور ایک بوڑھی مہترانی سے اُن کی فرضی شادی رچا دی گئی، اور یہ سب صرف اس جرم میں کہ وہ بے بس اور اپاہج تھے۔ اور بھی اس قسم کے درجنوں کردار ہیں، سب ٹوٹے پھوٹے چہروں کے لوگ لیکن دکھی دلوں کے مالک۔

میں سوچتا تھا یہ مخلوق کہاں سے آئی ہے۔ یہ مظالم کیوں ہو رہے ہیں، ان پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا۔ میرا خاندان اس پر قانع تھا کہ سب کچھ خدا کی دین ہے، امیر اور غریب ہمیشہ سے ہیں۔ ظلم و استبداد ہمیشہ سے ہے۔

اسی زمانے میں مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ اسلام میں زمین کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اور میں نے پہلی بار اپنے والد اور چچا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ سماجی زندگی اور ذاتی عقاید کی زندگی کے درمیان ایک اونچی دیوار ہے، اور جو سوالات مجھے پریشان کر رہے ہیں وہ دوسروں کو پریشان نہیں کرتے۔ میں نے قرآن اور حدیث کی مدد سے استدلال کرنے کی کوشش کی، خدا کے دیے ہوئے رزق سے کھاؤ پیو اور زمین پر فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ فتنہ و فساد برپا کرنے والے صاحبان اقتدار ہیں، جن کے ملازم میرے والد اور چچا ہیں۔ جنھیں اس کا اندازہ نہیں کہ وہ خود کتنے پسے اور دبے ہوئے ہیں۔ لیکن عام تصور یہ تھا کہ فتنہ و فساد کے ذمہ دار کسان ہیں اگر وہ بیگار سے انکار نہ کریں اور لگان ادا کریں اور ٹوٹا پھوٹا پہن کر اور آدھے پیٹ کھا کر خدا کا شکر کیا کریں تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔

مجھے سن یاد نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے بغاوت کر دی۔ ریاست کی فوج نے جواب میں سارے گاؤں میں آگ لگا دی اور کسان عورتوں کو بے عزت کیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا، اخباروں میں خبریں چھپیں اور کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اس معاملے کی تحقیقات کرنے آئے ریاست کے عملے نے ان کو گاؤں تک جانے سے روک دیا۔ اور راستے کی کچی

سڑک میں جابجا گڑھے کھود دیے گئے تاکہ پنڈت نہرو کی کار وہاں تک نہ پہونچ سکے۔

غالباً عید غدیر کا دن تھا یا یوں ہی ہمارے گھر میں کوئی محفل تھی۔ میں اس محفل میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے اس عام جلسے میں چلا گیا جہاں پنڈت نہرو نے جاگیرداری ظلم و استبداد کے خلاف تقریر کی۔ جلسے کے بعد میں واپس آیا تو گھر کے لوگ مجھ سے خفا تھے، اور میں ساری کائنات سے بیزار ظلم اور افلاس کے سماجی اسباب کے پہلے علم نے میرے دل میں چراغ جلا دیے تھے۔

اسی زمانے میں میں نے دو نہایت اہم کتابیں پڑھیں جنھوں نے میری زندگی بالکل پلٹ کر رکھ دی۔ ایک مہاتما گاندھی کی کتاب تلاش حق اور دوسری پلوٹارک کی کتاب "مشاہیر یونان و روما"۔ گاندھی جی کی کتاب میں پوری طرح نہ سمجھ سکا، اس لئے کہ وہ انگریزی میں تھی، اور میری انگریزی کی استعداد اتنی نہیں تھی۔ کتاب میرے چچا کی تھی جنھوں نے خود اسے بڑے شوق سے پڑھا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان سے اس کے مطالب دریافت کروں۔ خود ہی اسکی سیاہ چھپی ہوئی سطروں میں نور اور روشنی کی جستجو کرتا رہا۔ پلوٹارک کی کتاب انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے چھاپی تھی اور غالباً اس کا اردو ترجمہ ہاشمی فریدآبادی نے کیا تھا۔ اس کا اثر زیادہ گہرا پڑا کیونکہ میں اسے آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ خاص طور سے لیکرگس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کی کون سی ادا مجھے بھائی تھی۔

لیکن ان کتابوں نے میرے سوالات کو حل کرنے کے بجائے میرے دل میں اور آگ لگا دی۔ اس آگ کو کون بجھائے، نہ گھر میں کوئی میرا جواب دینے والا ہے اور نہ اسکول میں۔ نہ کتابیں نہ رسالے نہ اخبار، میرے والد اور چچا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لئے ان کو میرے سوالات دیوانگی معلوم ہوتے تھے۔ ان کی شفقت میرے دل کی آگ کو نہیں بجھا سکی۔ ایک واقعے نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک اور گاؤں میں بغاوت ہو گئی اور کسانوں نے ریاست کے تحصیلدار کو جان سے مار دیا۔ میرے بہنوئی جو ذیلدار تھے بہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگ آئے۔ سب کی ہمدردیاں میرے بہنوئی اور مرے ہوئے تحصیلدار کے ساتھ تھیں۔ میری ہمدردیاں کسانوں کے ساتھ۔

اب مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہو گئی، جس سے امارت کی ذرا سی بھی بو آتی ہو۔ میرا ردعمل صرف جذباتی تھا۔ اور عقل کو جذبات کی تنظیم کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس عالم میں میں نے ایک نظم کہی کہ خدا نہ تو غرناطہ و بغداد کے ایوانوں میں ہے نہ امیروں کے محلوں میں۔ خدا جو کی روٹی میں ہے، پیوندوں کی چادر میں ہے، اور کربلا میں چمکنے والی حسین ابن علی کی تلوار میں، اب اس کا ایک مصرعہ بھی یاد نہیں ہے۔ لیکن یہ نظم میں نے کئی مجلسوں میں پڑھی اور اسکی داد بھی ملی۔ اور تو کسی نے اس نظم کو نہیں سمجھا، لیکن والد اور چچا کے ملنے والے ایک گورنمنٹ کے تحصیلدار التجا حسین صاحب تھے، وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے، اُن کے کان کھڑے ہو گئے، انھوں نے نظم کی تعریف کی اور پھر مجھ سے پوچھا "تم خدا کو مانتے ہو" وہ مجھے اسی طرف لے جانا چاہتے تھے کہ امیر و غریب سب خدا کے

بنائے ہوئے ہیں، لیکن گفتگو میں بات یہاں آ پہونچی کہ میں نے کہا کہ "میں خدا کو اس لئے مانتا ہوں کہ رسول کو مانتا ہوں، بزرگوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ لیکن میں اس وقت اُن کے سامنے گستاخ ہو گیا تھا، میں یہاں تک کہہ گیا کہ "آپ کے پاس خدا کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، لیکن میرے پاس ہے اور وہ یہ کہ رسول نے کہا ہے کہ خدا ہے۔" میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا اور دیر تک اقبال کی بانگ درا پڑھتا رہا اور جب شکوہ کے اس بند پر پہونچا ؎

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمت ترے محبوب کی دیوانی تھی

تو خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں، کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے اقبال کی دلیل پیش کر کے آیا ہوں۔

اب خاندان میں میرا تھوڑا سا احترام بھی کیا جاتا تھا اور لوگ میرے نام پر زیرلب مسکرا بھی دیتے تھے۔

میں نے اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دی تھیں۔ ٹینس کھیلنا اور شکار کھیلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا۔ زیادہ تر کتابیں پڑھنے میں وقت گذارتا تھا۔ لیکن

کام کی کتابیں کم تھیں، سب سے اچھی کتاب بانگ درا تھی جو زبانی یاد ہو گئی تھی، اسی دوران میں نگار کے کچھ پرانے پرچے کہیں سے مل گئے، غالباً ۱۹۲۴ء کی فائلیں تھیں۔ ان میں پہلی بار غالباً نیاز فتحپوری کی کسی تحریر میں انقلاب روس کا ذکر ملا۔ اور میں نے اقبال کی خضر راہ کو اس کے ساتھ ملا کر اپنے خوابوں کی نئی دنیا تعمیر کرنا شروع کر دی۔

ماں باپ میری حالت پر کڑھتے تھے اور بہنیں مجھے حیرت سے دیکھتی تھیں۔ ایک رشتہ کی بہن تھی اسکی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ پسندیدگی کی چمک تھی، اور یہ چمک مجھ کو اس پر آمادہ کر دیتی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کروں، میں اس سے ہمیشہ مفلسی اور امارت، ظلم اور انصاف کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان کچھ نازک اور لطیف رشتے پیدا ہو گئے ہیں۔ اور میرے دل میں ایک نور سا بکھر گیا، برسوں بعد جب میری شادی کا سوال اٹھا تو میں نے اپنے والدین کو اس لڑکی کا نام بتا دیا لیکن لڑکی کے باپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اول جلول آوارہ گرد ٹھہرا نہ رہنے کا ٹھکانا ہوگا نہ کھانے کا لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی۔

یہ غالباً ۱۹۳۰ء کے آس پاس کی بات ہے کہ میں نے طے کر لیا کہ میں بلرام پور سے نکل جاؤں گا۔ اتفاق سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ جہازرانی کی ٹریننگ کے لئے اب ہندوستانی بھی لئے جائیں گے۔ کچھ ذوق آوارہ گردی کچھ بلرام پور سے نکل جانے کا شوق، میں نے اپنے والد سے جہازرانی میں جانے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے اجازت دے دی۔ میں مہینوں امتحان کی تیاری

کرتا رہا اور پھر لکھنؤ جا کر امتحان دیا۔ اور اس میں کامیاب ہوگیا۔ بمبئی سے بلاوا آگیا
میں بے انتہا خوش تھا، اور سفر کی تیاریاں کرنے لگا تھا کہ یکایک ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے
سارے خوابوں کو خاک میں ملا دیا۔

ایک مجتہد صاحب ہر سال تشریف لاتے تھے، میں جانے کی تیاری
میں تھا کہ وہ آگئے۔ جب میرے والد نے ان کے سامنے ذکر کیا تو کچھ شبہات کا
اظہار بھی ہوا، کس طرف سے ؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا معلوم ہے کہ مجھے
ان کے سامنے بلایا گیا اور پھر میرے سامنے استخارہ دیکھا گیا اور استخارہ
منع آگیا۔ میں نے اس وقت ذرا سی جھنجھلاہٹ محسوس کی پھر یہ تاویل کی چلو اچھا
ہوا۔ میں خواہ مخواہ انگریزوں کی ملازمت کرنے جا رہا تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۶ء
میں میری آنکھوں کے سامنے بمبئی کے جہازیوں نے بغاوت کی تو میرا دل اس
خیال سے تڑپ اٹھا کہ میں اس بغاوت میں شریک نہ ہو سکا۔ اسے ایک طرح
کی روحانیت کہہ لیجئے لیکن یہی روحانیت تو زندگی میں رس پیدا کرتی ہے۔
اب پھر ترام پور کا کنواں تھا اور میں، عمل کا کوئی راستہ دکھائی نہیں
دے رہا تھا۔ ذہنی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں، میں بے بس تھا۔ اور اندر ہی اندر پیچ و
تاب کھا رہا تھا۔

اس ذہنی کیفیت میں میں ۱۹۴۳ء میں علی گڈھ پہونچا۔ اس وقت میری عمر
بیس برس کی تھی۔ چونکہ میں نے ابتدائی چند سال عربی اور فارسی کی تعلیم میں گذارے
تھے، اور تب انگریزی اسکول میں داخلہ لیا تھا، اس لیے میں اپنی عمر کے اعتبار سے

تعلیم میں پچھڑا ہوا تھا۔ جب انٹرمیڈیٹ میں پہونچا تو میرے ہم عمر بی، اے اور ایم، اے کے طالب علم تھے۔

یہ زمانہ جتنا ہندوستان کی تاریخ میں اہم ہے اتنا ہی اردو ادب اور علی گڈھ کی تاریخ میں بھی۔ علی گڈھ تحریک نے انیسویں صدی میں اردو ادب کے دھارے کو موڑا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں غزل کی اصلاح کا سہرا بھی علی گڈھ ہی کے ایک سپوت مولانا حسرت موہانی کے سر ہے۔ دوسری دہائی میں دہاں کی رومانی تحریک میں بھی علی گڈھ کا اچھا خاصہ حصہ ہے، اور تیسری دہائی میں جب ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو نیا رخ دیا تو یہاں بھی علی گڈھ پیچھے نہیں رہا۔

جس زمانے میں میں وہاں پہونچا نئی تحریک کے اولین نقوش بن رہے تھے اور ادب اور سیاست مل کر ایک ہوئے جا رہے تھے۔ اختر رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور سب وہاں کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم استادوں میں تھے۔ بعد کو عصمت چغتائی بھی وہاں پہونچ گئیں اور جذبی بھی۔ اور یہ سب جدید اردو ادب کے نہایت اہم اور ہوشمند معمار ہیں۔

میں جس ذہنی کیفیت میں گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں سیدھا لائبریری کا رخ کروں۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ علی گڈھ میں کون کون ہے اور کس قسم کے طوفان پرورش پا رہے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہونچ گیا تھا کہ ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کے لئے علم بہت ضروری ہے، جس سے میں اب تک بری طرح محروم تھا۔

بغیر کسی ترتیب کے میرا ہاتھ جس کتاب پر پڑا اُسے پڑھ ڈالا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا ہاتھ کسی سیاسی کتاب پر نہیں پڑا۔ عام طور سے میں ادبی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ ان کے زیر اثر ملرام پور میں پیدا ہونے والے سوالات کچھ عرصے کے لئے دب گئے اور میں آسکر وائیلڈ میں کھو گیا، جس کی سالومی کے زیر اثر میں نے نہایت بے سر و پا ڈرامہ لکھا۔ غالباً اس کا نام "دیوانے" تھا۔ اور وہ علی گڈھ میگزین میں شائع ہوا تھا۔ اسکی نہ جانے کیوں میرے محترم استاد رشید صدیقی صاحب نے تعریف کی۔ اور بھی کچھ لوگوں نے اُسے سراہا۔ میں اس وقت تو خوش ہوا اور جب ذرا ہوش آیا تو حیران ہو گیا، اور آج بھی حیران ہوں۔ کیونکہ اس پر کسی قسم کے سیاسی اور سماجی شعور کی پرچھائیں بھی نہیں ہے۔ صرف لفاظی ہے اور وہ بھی انتہائی مصنوعی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ چند سال بعد رشید صاحب نے اپنی کتاب مجھے دستخط کرکے دی اور اس پر میرے لئے یہ لکھا کہ "جن کے بارے میں میری وہی رائے ہے جو میری غالب کے بارے میں تھی"۔ اس پر میں چونکا اور مجھے "دیوانے" کے مہمل ہونے کا یقین آگیا۔ غالب کی منزل تو نصیب نہیں ہوئی لیکن ہوش ضرور آگیا

لیکن میں آسکر وائیلڈ کی گرفت سے بہت پہلے نکل چکا تھا۔ جس زمانے میں میں اسکی سوانح عمری پڑھ رہا تھا تو گوئیٹے کا "ورتھ" میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس سے میں گوئٹے کی طرف مائل ہوا اور جب میں نے اس کا شاہکار فاؤسٹ پڑھا تو مجھے ادب کی حقیقی بلندی اور عظمت کا احساس ہوا۔

دل میں سوئے ہوئے سوالات پھر جاگنے لگے اور ایک روز مجھ

اتفاق سے ایک واقعے نے مجھے نئی راہ پر ڈال دیا۔ تقریریں کرنے کا مجھے بھی شوق تھا اور میرے دوست فرحت اللہ انصاری کو بھی۔ وہ چونکہ انگریزی میں تقریریں کرتے تھے اور وہ زمانہ یورپ میں فاشزم کے عروج کا زمانہ تھا، اور ہندوستان میں تحریکِ آزادی کی لہریں اونچی اٹھ رہی تھیں اس لئے احمد عباس کی تقریروں کی طرح ان کی تقریروں میں بھی سیاسی الفاظ کی بہتات ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے فرحت کی زبان سے بورژوا کا لفظ سنا اور اُن سے اس کے معنی پوچھے، جواب دینے کے بجائے وہ ہنسنے لگے۔ میں پھر لائبریری کی طرف بھاگا اور اس بار جب میں واپس آیا تو میری بغل میں لینن کی سوانح عمری تھی۔ مجھے اب یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ وہ کس کی لکھی ہوئی تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ جو دروازے گاندھی جی کی کتاب پڑھ کر اور نہرو کی تقریر سنکر ذرا ذرا سے کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے اس بار پورے کھل گئے۔ اور مجھے پیڑوں میں لٹکی ہوئی کسان عورتوں کو نیچے اتار کر اُن کا کھویا ہوا وقار واپس دینے کا طریقہ معلوم ہو گیا۔ میں فرحت کا شکر گذار ہوں کہ ان کی ایک ہنسی نے کتنے ہونٹوں کی کھوئی ہوئی ہنسی واپس دلادی۔

اسی زمانے میں مجاز سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہنس مکھ اور تندرست تھا۔ اور اسکی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ دہانہ تب بھی بہت کم کھلتا تھا، لیکن ترنم کا جادو اپنے شباب پر تھا۔ (مجھے یاد ہے سنہ ۱۹۳۶ء کی ایک شام مجاز رشید جہاں کے گھر پر اپنی کوئی نظم سنا رہا تھا، محمود الظفر اور شوکت عمر اور خواجہ منظور حسین بھی وہاں تھے۔ دو بچیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بچی نے کچھ کہا تو

دوسری بچی نے یہ کہہ کر اُسے خاموش کر دیا "چپ رہو باجا بج رہا ہے" ! مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ مجاز شاعر ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کورٹ پر ٹینس کھیلتے تھے، ایک روز مجاز کھیل کر واپس جا رہا تھا کہ اسکی پتلون تار میں الجھ کر پھٹ گئی ۔ غوث محمد نے ہنس کر کہا شاعر صاحب کی پتلون پھٹ گئی ۔ اور میں نے مڑ کر دیکھا کہ یہ کون شاعر ہے ۔ اسی رات کو یونین کے مشاعرے میں مجاز سے پہلی بار ملاقات ہوئی ۔ اسکی نظم اور ترنم دونوں میں جادو تھا ۔ نظم "انقلاب" تھی اور اس کے ہر مصرعے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہوئی ۔ اس دن سے ہم دونوں دوست ہو گئے ۔ یہ دوستی ۲۴ تیس برس تک اتنی ہی بے لوث اور خوبصورت رہی جتنی پہلے دن تھی ۔

اس مشاعرے میں میں نے اپنی نظم "سماج" پڑھی تھی جو ان شعروں پر ختم ہوتی تھی ؎

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے اُبلنے کو
زمانہ کس قدر بیتاب ہے کروٹ بدلنے کو

جب میں مشاعرے کے بعد باہر نکلا تو ایک انتہائی ذہین آنکھوں اور بیمار چہرے کا طالب علم مجھے اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے گیا کہ "میں بھی انقلابی ہوں" اس کے کمرے میں وکٹر ہیوگو کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی اور میز پر چند دوستوں کے ساتھ اس کی اپنی تصویر تھی ۔ جس کی پشت پر گورکی کا ایک

اقتباس لکھا ہوا تھا۔ یہ سعادت حسن منٹو تھا۔ اس نے مجھے بھگت سنگھ پر مضامین پڑھنے کے لئے دیے، اور وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کیا، میں جب اپنی تعلیم ختم کر کے لکھنؤ چلا گیا اور منٹو بمبئی تو اس نے مجھے کئی بار بمبئی بلایا۔ جب میں کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار میں کام کرنے کے لئے ۱۹۴۲ء میں بمبئی پہونچا تو میرے اور منٹو کے درمیان ادبی اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو چکی تھی۔ لیکن ہماری ذاتی دوستی میں فرق نہیں آیا۔ ویسے تلخ لمحات بھی آئے اور تیز و تند کیفیت بھی پیدا ہوئی۔ اس رات منٹو بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا اور ہم دونوں نے مل کر ایک رسالہ نکالنے کی اسکیم تیار کی۔ شاہد لطیف نے اسکا نام "نیا ادب" تجویز کیا یہ رسالہ پانچ چھ برس بعد لکھنؤ سے نکلا۔ لیکن منٹو اور شاہد لطیف کے بجائے مجاز اور سبط حسن میرے ساتھ تھے۔

یونیورسٹی علی گڑھ۔

۲۸، مارچ سنہ ۱۹۵۶ء

مخدومی آداب و نیاز

والا نامہ صادر ہوا۔ مجھے افسوس اور ندامت ہے کہ میں آپ کی، فرمائش پوری نہ کرسکوں گا۔ آپ نے جس محبت سے مضمون طلب فرمایا ہے، اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن بعض معذوریوں کی بنا پر تعمیل سے قاصر ہوں۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

خیر طلب
رشید احمد صدیقی

یونیورسٹی علی گڑھ ۱۶ر مئی ۵۶ء

محترمی، آداب

والا نامہ مورخہ ۱۴ر مئی ۵۶ء۔ آپ نے جن الفاظ میں میرا ذکر کیا ہے اس سے میں شرمندہ بھی ہوں اور آپ کا شکر گذار بھی۔ لیکن کیا کروں تعمیلِ ارسال سے بالکل قاصر ہوں۔ ورنہ میرے لئے یہ بڑے افسوس کی بات تھی کہ ایسے عزیز کو جیسے کہ آپ ہیں، مایوس کروں۔

خاکسار

رشید احمد صدیقی

۱۲ر جون ۵۶ء

محترمی، تسلیم

گرامی نامہ صادر ہوا۔ مجھے بڑی ندامت ہے کہ میں تعمیل ارسال نہ کرسکونگا۔ عذر کرنے کی جو مجھے تکلیف ہے اس کا اندازہ میں خود کر سکتا ہوں۔ یہ اس لئے کہ مضمون لکھ دینا ایسی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن بحالت موجودہ میرے لئے یہ کار بڑا مشکل ہے تقریباً ناممکن۔ اس لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

راج بھون پٹنہ، ۲۹ر مارچ ۵۹ء

مکرّم بندہ، تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپکی فرمائش

کی تعمیل نہ کر سکونگا۔ یوں بھی بہت کم لکھتا ہوں۔ خود اپنے متعلق تو لکھنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ مجھے معذور جان کر معاف فرمائیں۔

مخلص
ذاکر حسین

ضلع الہ آباد، ۳۰ جنوری ۶۵ء

یاد فرمائے نوح، سلام و نیاز
آپ کا محبت نامہ ملا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے ۸۰ برس کی عمر میں سیکڑوں مشاعرے دیکھے اور شریک ہو کر لطف اندوز ہوا۔ لیکن اب نہ سماعت ہے نہ بصارت دونوں سے محروم ہوں۔ باہر کے جو شاگرد تھے ان کی اصلاح سے بھی دستبردار ہو گیا۔ میرے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں جو ادبی کام کر سکے۔ جب کوئی اتفاقاً مل جاتا ہے تو اس سے خط لکھواتا اور پڑھواتا ہوں۔ ایسی صورت میں حالات لکھوانا اور آپ کے پاس بھیجنا میرے لئے بالکل ناممکن ہے۔ لہٰذا معافی چاہتا ہوں۔

فقط
نوح ناروی از نارا

"پاکستانز"، لاہور

محترمی،

آپ کا خط ملا۔ آپکے مجموعے کیلئے لکھنے کو جی ضرور چاہتا ہے لیکن بدقسمتی سے میں مصروف بھی ہوں اور کاہل بھی۔ اگر کسی دن فراغت اور توفیق میسّر ہو جائے تو کچھ لکھ بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن یہ وعدہ نہیں ہے اور آپ اِس سبب سے

کتاب کی اشاعت میں تاخیر نہ کیجئے۔ احباب کو سلام۔

مخلص

فیض

کشمیری محلہ، لکھنؤ، ۱۵ رمئی ۵۷ء

جناب والا، خدا کا شکریہ۔

میری صحت جواب دے چکی ہے۔ اور میں اس قابل نہیں کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل کرسکوں۔ لہٰذا معافی کا خواستگار ہوں۔ والسلام۔

اثر

اُردو گلی، حیدرآباد، ۸ رمئی ۵۸ء

برادرم جنید۔

آپ کے ۸ راپریل کے لکھے خط کا جواب آج ۸ رمئی یعنی پورے ایک مہینے کے بعد دے رہا ہوں تعویق کی معافی چاہتا ہوں۔ میں ایک مہینے سے حیدرآباد سے باہر تھا۔ دو دن پہلے جب گھر پہنچا تو آپ کا محبت نامہ ملا۔

آپ نے جس عنوان کے تحت مضمون لکھنے کی فرمائش کی ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کئی بزرگوں نے وعدہ بھی کرلیا ہے۔ اور اپریل کے آخر تک مضامین شاید آپ کو مل بھی جائیں۔ میرے لئے مشکل یہ ہے کہ بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ مجھے آج ۸ رسے ۲۶ رمئی تک حیدرآباد میں رہنے کا موقع ہے۔ پھر مجھے اپنے سیاسی کاروبار کے سلسلہ میں دو ہفتوں کے لئے صوبہ کے دوسرے حصوں میں جانا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ آخر مئی تک مضمون آپکو

مل جانا چاہیئے۔ اس لئے بمشکل دو ہفتے باقی رہ گئے ہیں۔ اس تنگ وقت میں مجوزہ عنوان کے تحت لکھنا آسان نہیں ہے، میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ ہاں اس بیچ میں کوشش کرونگا کہ مضمون لکھا جائے۔ اگر لکھا جا سکا (باوجود مصروفیتوں کے)، تو ضرور آپ کے پاس بھیج دونگا۔ آپ کی یادفرمائی کا شکریہ۔

سب احباب کو سلام و نیاز۔

آپ کا

مخدوم

۔تغلق کریسنٹ، نئی دلی، ۱۰ اپریل ۱۹۶۸ء

مکرمی، تسلیم۔

چند دن ہوئے آپ کا عنایت نامہ ملا۔ میرے لئے اس وقت اتنا بسیط کوئی بھی مضمون لکھنا مشکل ہے۔ میں پوری طرح سمجھا نہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ —— مہربانی فرماکر صاف صاف اور ذرا مفصل تحریر فرمایئے۔ ممکن ہوا تو کچھ لکھوں گا۔ زیادہ والسلام۔

خاکسار

سید محمود

اِتنا لکھوانے کے بعد آپ کا عنایت نامہ پھر پڑھوا کر سُنا اور معلوم ہوا کہ جو چیزیں آپ چاہتے ہیں کہ میں لکھوں ان کا احاطہ کرنے کے لئے تو ایک مبسوط کتاب درکار ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ پچاس پچپن برس کے دور سے واقفیت رکھنے والا اب دوسرا کوئی باقی نہ رہا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا

چاہیئے کریں نہ ادیب ہوں نہ فن کار اور جن مشاہیر سے لکھوائے ہیں ان کے ساتھ ساتھ میرا مضمون آپ کی کتاب کی زینت نہ ہوگا بہر حال ــــــــ

۱۵؍مئی ۵۸ء

محترمی، تسلیم!

آپ کا کارڈ ملا۔ میں آج ہی باہر جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ ہفتہ بھر یو پی کے ایک دیہات میں رہونگا۔ ممکن ہے وہاں آپ کے لئے کچھ ہیں جون کے شروع میں دِلّی واپس جاکر کوشش کرونگا۔ اگر ۱۵؍جون تک لکھ سکا تو شاید ہو جائیگا۔ اس کے بعد تو پھر شاید ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ پھر میں ماہ ڈیڑھ ماہ کے لئے بیرونی ممالک چلا جاؤں گا۔ زیادہ والسلام۔

خاکسار
سیّد محمود

۳؍جون ۵۸ء

جناب من تسلیم!

آپ کی فرمائش اور اصرار پر میں نے اپنے کچھ حالات لکھوانے شروع کر دیئے۔ اور پچاس صفحے ہو نگے۔ لیکن ابھی علی گڑھ کا زمانہ ہے ختم نہیں ہوا۔ کل سے لکھوانا بند کر دیا ہے۔ علی گڑھ کا زمانہ تو ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر جج کو گیا تو پورا مضمون شاید ہی ختم ہو۔ اگر میں گیا تو بمبئی ضرور آنا ہوگا۔ مجھ سے وہاں ملیئے۔ میں حسین بھائی لالجی کے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ وہ ۶۱۔ وارڈن روڈ، (61, Warden Road) پر رہتے ہیں۔ اگر میں آیا تو ۱۱؍جون تک بمبئی ضرور

آجاؤں گا۔ اگر نہ گیا تو مضمون ہفتہ دو ہفتہ میں ضرور ختم کر دوں گا۔ اطلاعاً لکھ دیا تاکہ آپ کو انتظار کی زحمت نہ ہو۔

خاکسار
سید محمود

---

۴ ہیٹنگ روڈ، الہ آباد ۱۰ اگست ۵۷ء

مائی ڈیر مظفر بھائی۔

تمہارا محبت نامہ ملا تھا۔ تمہارے بڑے لڑکے کے انتقال کی خبر بھی بمبئی سے ملی تھی۔ جنید کے بھی متعدد خطوط آتے رہے۔ ادھر میری صحت بہت ڈانواڈول ہے اس وقت فالکیریا کا دورہ پڑ گیا ہے۔ علاج سے رفتہ رفتہ افاقہ ہو رہا ہے۔ تم نے اور جنید نے جس خلوص اور محبت سے مجھے بمبئی بلایا ہے، کن لفظوں سے اس کا شکریہ ادا کروں۔ تم لوگوں کے دعوت ناموں نے مجھے مجبور کر دیا اور میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ۲۶ یا ۲۷ دسمبر کو بمبئی پہنچ جاؤں۔ چار دن اور چار راتوں کے لئے۔ کسی نہ کسی کو سفر میں ساتھ رکھنا پڑے گا۔ اگر دو آدمیوں کا فرسٹ کلاس کرایہ آمد و رفت اور تین سو روپے کا اس کے علاوہ انتظام ہو جائے تو اچھا ہو۔ اگر تم لوگوں کی مجبوری اس امر میں مانع ہو تو صاف صاف لکھ بھیجو کہ کل کتنے روپوں کا انتظام کر سکو گے۔ کیونکہ تم سے یا جنید سے میں کوئی سودا نہیں کرنا چاہتا۔ میرے لئے روپوں کا سوال بہت بعد کا سوال ہے۔ اصل سوال صحت کا ہے۔ جنید نے جس کتاب کے مسودے کیلئے مجھے لکھا تھا وہ ایک طرح کی میری سوانح عمری ہو گی۔ ڈیڑھ سال بعد ریٹائر ہو رہا ہوں، اس کے بعد ہی اس کام میں ہاتھ لگا سکونگا۔ اب تک کی نظم و نثر کی جو تصنیفیں ہیں،

دس جلدوں میں اُن کا سیٹ نکالنے کا ارادہ ہے۔ پہلی جلد کی کتابت شروع ہو گئی ہے۔ اگلے پانچ برسوں میں یہ سیٹ نکل جائے تو مجھے بڑا اطمینان ہو گا۔ اگر مجھے اخیر دسمبر میں بلا رہے ہو تو اس کے لئے ابھی سے کوششیں شروع کر دو۔ چھٹی بجاتے تین مہینے کٹ جائینگے۔ اعجاز صاحب اور ایک آدھ اور مسلمان پروفیسر اکثر بمبئی گئے ہیں۔ وہاں کے بوہرے یا شیعہ حضرات ان کی تقریریں کراتے ہیں۔ اور کافی رقمیں ان کو دیتے ہیں۔ ان حلقوں سے ممکن ہو تو ملکر ایسا انتظام کرو کہ میں ایک آدھ تقریر اُن کے جلسوں میں بھی کر دوں۔ غالباً اس طرح مجھے کوئی اچھی رقم ملجائے۔ اور باتیں تلوگوں کا جواب آنے پر لکھونگا۔ یہ خط جنید کو بھی پڑھ کر سنا دینا۔ راجندر کرشن کو بھی میرا بہت بہت پیار کہو۔ پچھلی بار جس تپاک اور محبت سے وہ مجھے مراد کے ہاں ملے تھے اور جس محبت سے وہ اسٹیشن پہنچانے آئے تھے اس کی یاد میرے دل میں ابتک تازہ ہے۔ شاید اس بات کی امید رکھنا تو فضول ہے کہ کسی فلم میں میری کچھ غزلیں ان حضرات کی وساطت سے یا راجندر کرشن کی کوشش سے خریدی جا سکیں گی۔ بہر حال یہ بات ذہن میں آئی تھی اس لئے لکھ دی۔ وہاں تمام دوستوں کو میرا بہت بہت سلام۔ بچوں کو پیار۔

تمہارا
فراق

نوٹ :۔ اگر بڑے پیمانے پر کئی جلسوں اور تقریروں یا صحبتوں کا انتظام مدِنظر ہو اور ممکن بھی ہو تو میں ۲۲ دسمبر کو ہی بمبئی پہنچ سکتا ہوں اور ۱۲ کی رات کو وہاں سے الہ آباد کے لئے آ سکتا ہوں۔ یعنی

پورے ۷ دن قیام کر سکتا ہوں۔ آپ اور جنید تو محض معمولی سا بار اپنے ذمہ لیں۔ ایسے لوگوں اور حلقوں پر یہ بار ڈالیے کہ مجھ سے تقریریں کرائیں اور میں اپنا کلام سناؤں۔ اپنی غیر ادبی اور ادبی زندگی کے قیمتی تجربے بیان کروں۔ شارٹ ہینڈ رپورٹر بھی ہاتھ آجائے تو میرے قیام بمبئی کے متعلق، ایک کتابچہ بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔ سوالات اور جوابات کی بھی ایک مجلس یعنی ایک پریس کانفرنس بھی منعقد کی جا سکتی ہے جس میں مختلف مسائل پر اپنے خیالات کا میں اظہار کر سکتا ہوں۔ زندگی کے ساٹھ برس کے تجربات و مشاہدات اور اس کی یادیں سبھی کچھ ایسی ایک یا دو مجلسوں کے ذریعے قلمبند ہو سکتی ہیں۔

فراق

محبی جنید!

گذشتہ کئی مہینوں کے اندر آپ کے متعدد خطوط نظر نواز ہوئے۔ یہ میری بد توفیقی کہ جواب لکھوانے کی نوبت آج آ رہی ہے۔ آج میں دلّی جا رہا ہوں جہاں کل سے تین دن تک برابر مشاعرے ہوں گے۔ وہیں سے دو دن بعد پاکستان (لائل پور) کے مشاعرے میں شرکت کرنے جا رہا ہوں۔ الہ آباد ۵ یا ۱۶ اپریل تک واپس آؤنگا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں صورت حال یہ رہیگی کہ دور دراز کا کوئی سفر نہ کر سکونگا۔ اصل حقیقت سے آپکو واقف کر دینا چاہتا ہوں۔ میری عمر اور صحت

کا تقاضا یہ ہے کہ یونیورسٹی میں اپنے منصبی فرائض پورا کرنے کے بعد خطوط کا جواب دینا تو دور رہا، خطوط کو پڑھ سکنے کے قابل بھی اپنے کو نہیں پاتا۔ سال بھر میں کوئی نظم یا غزل ہو گئی تو اسے کاپی میں درج کر لیتا ہوں۔ اگر بمبئی کبھی آؤنگا تو ریٹائرمنٹ کے بعد یعنی ۳۱ر دسمبر سنہ ۱۹۵۹ء کے بعد۔ کتابوں کی اشاعت کا کام جو آپ شروع کر رہے ہیں اس میں آپکی کامیابی کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں۔ مجھے آپ نے لکھا ہے کہ اردو ادب میں جنسیات پر ایک کتاب لکھ کر آپ کو دوں۔ یہ لوگ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ میں نے تمام اردو شاعری اور نثری ادب کا مطالعہ کر ڈالا ہے۔ بہر حال یہ میں نہیں کر سکا ہوں۔ اور نہ کر سکونگا۔ اگر کوئی کتاب اپنے پسند کئے ہوئے موضوع پر لکھنے کا ارادہ ہوا تو آپ کو ضرور اطلاع دونگا۔ اگلے تین چار برسوں تک تو مجھے اپنے کلام کی تدوین میں ہی لگا رہنا ہے۔ کتابیں لکھنے کی فرصت کب ملے گی یہ میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ ایک بات اور گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ اپنا تکیہ چھوڑ کر کہیں اور آنے جانے اور قیام کرنے میں میں اپنا جسمانی، ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہوں۔ جب کبھی بمبئی سفر پر گیا ہوں۔ تو ذہنی تکلیف آنے جانے اور باہر قیام کرنے میں یکساں رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تین۔ تین۔ چار۔ چار برسوں کے وقفوں پر مناسب ساتھیوں کے ساتھ محض سیر و تفریح کے لئے کہیں چلا جاؤں ورنہ اب ارادہ یہی ہے کہ اپنی جگہ بیٹھا، جو کام مجھ سے بن پڑے وہ کرتا رہوں۔ کبھی کبھی یاد فرما لیا کیجئے۔

آپ کا
فراق

۲۳ بینک روڈ الٰہ آباد، ۲۰ر جون ۵۸ء

ڈیئر جنید!

خط لکھتے ہاتھ کانپتا ہے۔ رعشہ ہے۔ اب سے سات آٹھ ماہ تک کچھ نہیں لکھ سکونگا۔ کیسے کسی کو یقین دلاؤں کہ ایسی پریشانیاں لاحق ہوگئی ہیں، جن سے مدت دراز تک نجات پانے کی کوئی امید نہیں۔

فراق

سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور، ۲۰ر اگست ۵۸ء

مکرمی، تسلیم۔

۱۴ر ماہ اگست کا عنایت نامہ ملے ہوئے کئی روز ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپکو کیا لکھوں۔ آپکے کئی خطوط کے جواب میں جب میں نے اپنے صاحبزادے قمر سے لکھوا دیا تھا کہ روپیے بھجد یجیے تو اس وقت کالج میں بھی چھٹیاں تھیں۔ لیکن شامت سے اِنہیں چھٹیوں میں میں خاصا بیمار رہا اور اب بھی صحت کچھ اچھی نہیں ہے۔ اور اب کالج کھُل گیا ہے۔ جس کی وجہ سے برائے نام بھی فرصت اور فراغت کے لمحے نصیب نہیں ہوتے۔ مجھے بڑی شرمندگی کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں فی الحال اس قابل نہیں کہ کچھ لکھ سکوں۔ اس لئے آپ کے شخصیات کے مجموعے کے لئے میں کچھ نہ کر سکونگا۔ میں نے فوراً آپ کے خط میں آپ کا روپیہ منی آرڈر واپس کر دینا وضع مروت کے خلاف سمجھا۔ اس لئے یہ تمہیدی پوسٹ کارڈ معذرت کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ آپ ہی کچھ تجویز کیجئے میں کیا کروں؟۔ آپ کا جواب پاکر آپ کی رقم بذریعہ چک یا منی آرڈر ارسال خدمت

کر دوں گا۔ اُمید ہے آپ میری مجبوریوں کو سمجھینگے۔

آپ کا نیاز مند
مجنوںؔ گورکھپوری.

گورکھپور (یوپی)، ۲۰ نومبر ۱۹۵۸ء

محترم مہربان، سلام علیکم۔

میں آپ سے نہ صرف شرمندہ ہوں بلکہ اپنی ذات سے بے انتہا برہم ہوں۔ جب آپ کا پہلا خط مجھے ملا ہے تو میں نے اپنے لڑکے سے آپ کو جواب دلوا دیا تھا کہ میں شخصیات و واقعات پر لکھنے کے لئے تیار ہوں۔ کچھ اس لئے نہیں کہ آپ مجھے پچاس روپے بھیجنے والے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ نہیں نہیں پر بھی میرے اندر لکھنے کا ایک نیم جان وَلوَلہ ابھی باقی ہے۔ اور میں خود کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا چاہتا ہوں۔ اُس زمانہ میں میری چھٹیاں تھیں اور فرصت اور یکسوئی کا احساس تھا لیکن بہت جلد مجھے اپنی غلطی کا احساس بھی ہونے لگا۔ آپ سے وعدہ کرنے سے پہلے میں نے بہت سے کام اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ جنکو ابتک دھیرے دھیرے کچھوے کی رفتار سے پورا کر رہا ہوں۔ فرصت کی میعاد بہت جلد ختم ہوگئی۔ آپ کا کام نہ ہوسکا۔ اس کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے وہاں سب سے بڑا سبب یہ بھی تھا کہ جس عنوان کا مضمون آپ چاہتے ہیں اس کے لئے اپنے مزاج کے اعتبار سے میں اپنے کو موزوں نہیں پاتا۔ میری زندگی میں شخصیات اور واقعات کچھ زیادہ قوی موثرات نہیں رہے ہیں۔ مطالعہ اور غور و فکر اور استدراک و استنباط نے میری طبیعت اور میری زندگی کے بنانے بگاڑنے میں

زیادہ حصہ لیا ہے۔ بطل پرستی (Hero - worship) کا تو میں دشمن رہا ہوں۔ بڑے سے بڑے پیغمبر کو بھی میں نے پیغمبر سے زیادہ اپنے اور آپ کے قسم کا انسان سمجھا جس کو زمانہ اور ماحول کے حالات اور عوارض نے وہ بنایا جو وہ ہوا۔ غرضکہ شخصیات و واقعات پر لکھنا میرے لئے خاصی مہم ہے۔ یہ سچ ہے کہ مجھے ساری عمر میں جو اب نصف صدی سے زائد ہو چکی ہے، زندگی کے مختلف شعبوں میں بے شمار شخصیتوں اور واقعات سے سابقہ پڑا ہے اور میرے تجربات اور ملاقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لیکن اول تو جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں ان کا اثر میری زندگی میں بہت کم ہے۔ دوسرے اگر میں جائزہ لینے اور محاکمہ کرنے بیٹھوں تو نہ جانے مجھ سے کون خوش ہو اور کون آزردہ اس لئے کہ کافی بے درد اور بے دریغ مشہور ہوں۔ اور میں اپنی فطرت سے مجبور رہوں۔ انہیں سب باتوں پر غور کر کے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آپ کے دیئے ہوئے موضوع پر میں قلم نہ اٹھاؤنگا۔ لیکن آپ کے پیہم تقاضوں نے میری مشکل بڑھا دی ہے۔ نہ یہ ہمت پڑتی کہ آپ کے پچاس روپئے واپس کر دوں، اور صاف کہہ دوں کہ مجھ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھے گی اور نہ مضمون لکھتے بنتا۔

چیست یاران طریقت بعد ازین تدبیر ما

آج آپ کا ۱۸ر نومبر کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب آپ کی رقم واپس کر دوں۔ لیکن اتفاق سے جس وقت میں آپ کا خط پڑھ رہا تھا بیوی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انتہائی تلخی میں آپ کا خط ان کے سامنے بڑھا دیا۔ پڑھنے کے بعد ارشاد ہوا کہ" اتنا کچھ قلم سے گھسیٹا

کرتے ہیں۔ کیوں نہیں بے چارے کے لئے کچھ لکھ دیتے۔" میں نے کہا "بیگم۔ تم نے ۳۱ سال کی رفاقت کے بعد بھی مجھے نہ سمجھا۔ یا اتنا ہی سمجھا جتنا کہ جنید احمد نے جنہوں نے آج تک میری شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔" میرے تیکھے پن کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور جوں کے توں ہموار تیوروں کے ساتھ انہوں نے کہا۔ " لکھ نہ دیجئے۔ آخر آپ تو لکھتے ہی رہتے ہیں اور آپ کا کچھ جاتا نہیں سوا روشنائی اور کاغذ کے جس کی آپ کے پاس کمی نہیں"۔ میں نے فوراً سر تسلیم خم کر کے طے کر لیا کہ پہلے تو آپ کو جواب لکھ دوں۔ اور پھر پنسل ہاتھ میں لیکر آپ کے فرمان کی تعمیل کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن آپ سے گذارش ہے کہ اگر مضمون پورا ہو گیا تو پہلے ہفتہ دسمبر تک اس کو آپکی ہدایت کے مطابق مبلغ پچاس روپے پر آپ کے نام وی پی کر دونگا۔ نہیں تو آپ معذرت کے طور پر میرا یہ خط جی چاہے شائع کر دیجئے اور اپنے کو تمام الزامات سے بری کر لیجئے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اگر میں نے مضمون لکھ ڈالا تو آپ اپنے کو عجیب شکل میں پائیں گے۔ پہلی بات تو یہ ہو گی کہ اس میں شخصیات و واقعات کے علاوہ میرے مطالعات اور "مفکرات" بھی ہونگے جنہوں نے میری زندگی کا رخ متعین کرنے میں زبردست حصہ لیا ہے۔ دوسرے میرے مضمون میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو اور رام ناتھ جھا (مرحوم) سے لیکر ادنیٰ سے ادنیٰ کسان اور مزدور تک کا ذکر ہو گا جن سے میں نے عبرت و ~~بصیرت~~ حاصل کی ہے۔ اور سب کو ایک پیمانے یعنے انسانیت کے پیمانے سے جانچونگا۔ ممکن ہے بہتیرے اس پر ناک بھوں چڑھائیں۔ مگر میں مجبور ہوں۔

اگر میں نے مضمون لکھ کر بھیجا تو اس کا عنوان "یادِ ایام" ہوگا۔ اب تقریباً پچیس سال پہلے میں نے اپنے رسالہ "ایوان" میں ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا جو بعد کو نامکمل "تنویر" بمبئی (جسکی اڈیٹر اصغری بیگم سحر تھیں) میں بھی شائع ہوا تھا مگر جو بالآخر نامکمل ہی رہ گیا۔ اس کا عنوان بھی "یادِ ایام" ہی تھا۔ اگر یہ سب بادِ ہوائی باتیں آپ پسند کریں تو میں مضمون لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر میری کوشش بارآور ہوئی تو آپ کی نذر ہوگی۔ ورنہ مجھے معذور سمجھیے گا اور ٹھنڈے دل سے معاف کر دیجیے گا۔ اگر موقع ملے اور آپ مناسب سمجھیں تو میرا یہ خط علی سردار جعفری کو بھی دکھا دیجیے گا۔ ان کے ایک نہایت اہم خط (پوسٹ کارڈ) کا جواب مجھ پر واجب ہے۔

آپ کے جواب کا انتظار کروں گا اور اس کے بعد قطعی فیصلہ کرونگا کہ آپ کے حکم کے سلسلہ میں میں آخر کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

آپ نے کاغذ اور ٹکٹ بھیج کر مجھے گویا میری نالائقی کا طعنہ دیا ہے۔ مگر خیر۔ والسلام

آپ کا مخلص نیاز مند
مجنوں گورکھپوری

۵ رجنوری ۵۸ء

مکرّم مہربان۔ سلام علیک۔ سال نو مبارک۔

میں ابھی پریشانیوں کے عالم میں پورا ایک مہینہ لکھنؤ میں گذار کر واپس آیا تو آپ کا کارڈ ملا۔ لڑکے کی بیماری کے سلسلہ میں کئی ماہ سے دماغ پراگندہ

رہا۔ اسی کے اپریشن کی غرض سے لکھنؤ گیا تھا۔ نہ پوچھیے کیسا وقت کٹا! اپریشن کامیاب رہا لیکن ابھی ترددات باقی ہیں اور خیالات منتشر۔ اس پر مصیبت یہ ہے کہ یہ کالج کی زندگی کا بحرانی زمانہ ہوتا ہے۔ دو مہینے شدید مصروفیتوں کا رہے گا۔ مختصر یہ کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل سے بری طرح قاصر رہا اور فی الحال دُور سے بھی کوئی امید نظر نہیں آتی کہ میں آپکی فرمائش پوری کر سکوں۔ میں نے اپنے اندیشوں کا آپ سے اظہار کر دیا تھا۔ بہر حال میں آپ سے بُری طرح شرمندہ ہوں۔ ایسی شرمندگی مجھے آج تک کسی سے نہیں ہوئی۔ خدا کے لئے حالات کی ناگریزی کو سمجھکر مجھے معاف کر دیجئے۔ پہلے آپ اس خط کے جواب میں دو سطریں لکھکر مجھے مطمئن کر دیجئے کہ آپ نے واقعی مجھے خندہ پیشانی اور فراخ دلی کے ساتھ معاف کر دیا ہے تو میں آپ کی رقم واپس کروں جو ابتک میرے پاس امانت رکھی ہوئی ہے۔ آپ مجھ پر اعتماد رکھیئے کہ اگر آپ نے اپنا ادبی کاروبار جاری رکھا تو خود اپنے شوق سے جلد یا دیر اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرونگا۔ اور کچھ نہ کچھ لکھ کر آپکی خدمت میں پیش کروں گا۔

آپ نے میرے لڑکے بدر عالم راحل کے ساتھ جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور میرے اطمینان خاطر کے لئے اس کے بارے میں جو ہمت آفرین الفاظ استعمال کئے ان کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔ وقتاً فوقتاً بہ شرط فرصت ان کی خبر لیتے رہیئے۔ اور ایک کارڈ سے مجھے مطلع کرتے رہیئے۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر دست بستہ آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور اُمید لگائے ہوئے

ہوں کہ آپ نے واقعی مجھے معاف کر دیا ہوگا۔ جزاک اللہ!

آپ کا مخلص نیاز مند

مجنوں گورکھپوری۔

ماٹنگا، ۲۹ر جون ۵۰ء

بھائی جنید صاحب۔ تسلیمات۔

میں وعدہ خلافی کی معافی چاہتا ہوں۔ "عذر گناہ" یہ ہے کہ پہلے بیمار پڑ گیا۔ پھر ایک فلم کے آخری مناظر لکھنے کے لیے کھنڈالہ جانا پڑا۔ کچھ دن اور دے دیجئے تو میں مضمون مکمل کر کے بھیج دونگا۔

بھابی صاحبہ کی خدمت میں سلام، عزیزوں کو پیار۔

مخلص

راجندر سنگھ بیدی

۱۸ر ستمبر ۵۸ء

محترم جنید بھائی۔ تسلیمات۔

آپ کے خط۔ خطوط، مع ٹکٹ ملے۔ جب کسی کے پاس کوئی بات کہنے کو نہ ہو تو وہ کیا کرے۔ مجھے بمبئی کے ہنگاموں نے آ لیا ہے۔ اگرچہ یہ بات آپ کو بے معنی معلوم ہو گی لیکن اس کے سوا کہا بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں جلدی ہی مضمون لکھ بھیجوں گا۔ آپ کی بھابی اپنی بھابی کو سلام کہتی ہیں اور میں بھی یہی کہتا ہوں اور عزیزوں اور عزیزاؤں کو پیار بھیجتا ہوں اور اُن لذیذ کھانوں کو یاد کرتا ہوں جو آپ کے ہاں کھائے ہیں۔

آپ کا،۔ راجندر سنگھ بیدی۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۵۸ء

مکرمی مغلی، سلام۔

ڈیزائن میں نے کر دیا ہے۔ اور آج ارسال خدمت ہے۔ میں نے ایک بلند عمارت اور بلند دروازہ یعنی ایک شخصیت کا تصور کھڑا کر دیا ہے اور پھر اس کے پہلو بہ پہلو افتاد کا بھی ایک خاکہ موجود ہے۔ گلدان، پھول اور اسکی جندی۔ یہ ڈیزائن پورے سائز کا ہے۔ اس کا بلاک بنوائیں اور ہر کتاب کے نیچے نئی رنگ کی فیلٹ گراؤنڈ ڈیزائن چھاپنے سے پہلے دے لیا کریں۔ اگر اس سے زیادہ درکار ہو تو کسی سمجھدار دوست سے گلدان اور پھول پر رنگ لگوائیں اور اس جگہ کو گراؤنڈ سے خارج کر دیں تاکہ رنگ الگ الگ معلوم دے۔ اگر کوئی کرنیوالا نہ ملے اور ضرورت ہو تو مجھے چار پانچ بلاک کے پروف بھیج دیں میں خود رنگ لگاکر واپس کر دونگا۔

سردار جعفری صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیں۔

والسلام

۲۵ نومبر ۱۹۵۸ء

مکرمی سلام۔

جس مضمون کا آپ نے ذکر کیا ہے اپنی ضرورت کے مطابق اسکی تفصیل دیں۔ میں اپنی پوری توجہ سے لکھ دونگا۔ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ سردار جعفری کی خدمت اپنا فرض ہے۔ اگر ڈیزائن میں رنگ لگوانا منظور ہو تو جلد سے جلد اس کے چار پانچ پروف بھیج دیں رنگ لگاکر واپس بھیج دوں گا۔ میں ان دنوں ایک فلمی پنجابی کہانی "ٹھنڈیاں چھاواں"

لکھنے میں کچھ زیادہ مصروف ہوں۔ اگرچہ یہ کہانی بھی میں نے آج سے دس
بارہ سال پہلے لکھی تھی مگر بے کار نہ جانے کے خیال سے ایک فلمی ادارے
کو دیدی ہے۔ یہی کام مجھے سحر لدھیانوی صاحب سے تھا۔ کیونکہ سنتا ہوں
وہ آج کل تاج محل کی کہانی لکھ رہے ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل میں نے اپنے
ایک خط میں سردار جعفری صاحب کو لکھی تھی کہ شاید میری کوشش آپ لوگوں
کے کچھ کام آ سکے۔ تاج محل کی کہانی میں نے آج سے دس بارہ سال پہلے
لکھی تھی تاکہ مغلوں کی تمام کائنات ایسے سانچے میں ڈھل جائے جس سے
ان کی پوری پوری ترجمانی ہو سکے۔ اور میرا خیال اور مفہوم دوسرا بھی کیا بھی
شکل سے کہ فلم میں ان کو کس طرح پیش کرنا اس تہذیب کا حصہ ہے۔
پنجابی کہانیاں اور ہی لکھی جاتی ہیں اور بمبئی فلم بن بنکر دیکھتے دیکھتے
گم ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ لوگ فلم بنا سکے تو دنیا کہیگی یہاں تک کہانی کا پنجاب
کی ہوا اس کا تعلق ہے۔ ایک پنجابی نے دیکھا اور سوچا ہے۔

والسلام

۱۷ جنوری ۵۸ء

مکرمی مظفی، سلام مسنون۔

میں نے "نگاہ" کے لئے اپنا مضمون یا افسانہ اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ پہلے
نمبر میں حقداروں کے مضمون چھپنے کا موقع کھو دینا کم عقلی ہے۔ یہ پڑھ کر افسوس
ہوا کہ ابھی تک آپ دوسروں کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ سردار جعفری صاحب خود
ایک دو نظمیں لکھکر نگاہ کو نگاہ بنا دیتے تو اس کی مقبولیت کچھ اور بڑھ
جاتی۔ دوسرے عرض ہے کہ میں اتنا مصروف ہوں کہ کچھ بھی لکھ نہ سکوں گا۔ آپ

مجھ سے مارچ کے اندر توقع رکھیں۔ مواد میرے ذہن میں ہے۔ لکھ دونگا۔ ایسا لکھ دونگا جس سے یقیناً دنیا کو کچھ فائدہ ہوگا۔ میری زندگی رومان بھی ہے اور ایک مسلسل جدو جہد بھی جس کی ابھی تک انتہا نہیں ہوئی۔

یاد آوری کا شکریہ۔ نگاہ شائع ہو جائے تو مجھے ضرور دیکھنے کا موقع دیں۔ اور میں دوسرے پرچے کے لئے ضرور لکھونگا اور ضرورت کے مطابق ہی

والسلام

۱۷ اپریل ۵۸ء

مکرمی منظمی جنید صاحب، سلام مسنون۔

میں لاہور سے باہر تھا اس لئے آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ میں ماہ رمضان میں اکثر کام نہیں کیا کرتا۔ اس لئے بھی غافل رہا۔ خدا آپ کو عید مبارک کا پیغام دے تاکہ آپ زندگی سے مطمئن رہیں۔ اور دوسرے کہیں زیادہ انسانوں کا فکر ہے۔ رسول اکرمؐ نے کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا تھا۔ "مجھے ایک مسلمان کا خون بھی اس سے زیادہ ہے جہاں کروڑوں کا سوال بھی سوال الجھن تو نہیں عام بدحالی کا احساس دامنگیر ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں غلام کی بصیرت پر شک و شبہ بھی تقاضا ہے۔ زندگی ہے تو عید کے فوراً بعد مضمون شروع کرونگا۔ کروں بھی تو کیا کروں، ہزار کام ہزار دھندے رہتے ہیں۔ اطمینان سے اپنے فن کی دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتا۔ فرض فرض ہے اور فرض کی ادائیگی کے لیے بعض اوقات اپنی آواز اپنے ضمیر کے خلاف بلند کرنی پڑتی ہے۔ آپ کی یاد آوری کا شکریہ۔ بمبئی آنیکی ایک تمنا نہیں کئی تمنائیں ساتھ ہیں۔ سردار جعفری کو سلام پہنچا دیں۔ والسلام

چغتائی

شیش محل، راوی روڈ، لاہور، ۲ جون ۵۸ء

مکرمی معظمی، سلام مسنون۔

میں مقالہ لکھنے میں مصروف ہوں۔ مگر اتنا مصروف نہیں کہ ہر گھڑی یہی کام سامنے ہے۔ کیا کروں مصروفیتیں کچھ اتنی رہتی ہیں کہ آدمی پوری طرح سے کسی ایک کام کو توجہ بھی نہیں دے سکتا۔ میرا ذاتی خیال ہے میں جولائی کے درمیانی حصے میں مقالہ لکھ کر ضرور بھیج دوں گا۔ اگر اس عرصے میں آپ کا کام رکتا ہو تو کتاب پریس میں دے دیجئے۔ میرا لکھا پھر کسی دوسری ضرورت کے لئے کام آجائیگا۔ میں شرمندہ ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں جو کام کرنے کا وعدہ کرتا ہوں ضرور کرتا ہوں۔ مگر اس دفعہ میں اپنی کتاب کی تیاری کے سلسلے میں کچھ اسقدر الجھا ہوں کہ کیا بیان کروں۔ دوبارہ صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں کہ آپ اپنا قیمتی وقت اور پروگرام میرے لئے نہ روکیں۔ خدا بہت برکت دیگا۔ آجکل لاہور میں گرمی کا زور اس قدر ہے کہ مصروفیتوں کے بعد بھی صحیح کام کرنا مشکل ہے۔ آپکی یاد آوری کا شکریہ۔ اپنے ارادے سے مجھے ضرور مطلع کر دیں تاکہ غافل نہ رہوں۔ یا اتنا غافل ہو جاؤں کہ کام کی ضرورت کا احساس جاتا رہے۔ والسلام۔

مخلص

چغتائی

وہ محبوب کی فلم تاج محل اور سردار جعفری کا کیا بنا۔
اور نگاہ کب تک نگاہ بننے کو ہے؟

معرفت لطیف سنس اینڈ کمپنی، ۸۔ کوڈولا
اسٹریٹ، کلکتہ نمبر ۱، ۵ راپریل ۵۸ء

کرم فرمائے بندہ، تسلیم۔

عنایت نامہ آگرہ سے یہاں موصول ہوا۔ یاد فرمائی کے لئے ممنون ہوں جس نوعیت کا مضمون مطلوب ہے اس کے لئے وقت بالکل ناکافی ہے۔ اسلئے معذور ہوں۔ میرے پاس دو مجموعے مرتب شدہ تیار ہیں۔ ایک "امریکن طرز زندگی" دوسرا "سوویٹ کردار" پہلے مجموعے میں ایک حصہ افسانوی ہے۔ اور امریکن طرز زندگی سے متعلق خود امریکن اور سوویٹ اہل قلم کے منتخب افسانے ہیں۔ دوسرے حصے میں مضامین ہیں "سوویٹ کردار" سوویٹ ادب کی منتخبات ہیں۔ ان میں اگر کوئی مجموعہ آپ شائع کرنا چاہیں تو حاضر کردوں گا۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

مرسلہ
لطیف الدین احمد

۹ رجون ۵۸ء

کرم فرمائے بندہ، تسلیم۔

۵ رجون کا کارڈ ملا۔ اور یہ معلوم ہوکر ملال ہوا کہ ادھر آپکو پریشانیاں لاحق رہیں۔ دعا ہے کہ آپ جلد کامل اطمینان حاصل کرسکیں۔ انسان کو حوصلہ ہر حالت میں بلند رکھنا چاہیئے۔ "شخصیات و واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا" مجھے افسوس ہے کہ یہ چند مہینے ضائع ہوگئے۔ اگر اس وقت جون تک کی مہلت ہوتی تو کوشش بھی کرتا۔ خیر! آپ جو کچھ فراہم کرسکے ہیں اُسے شائع کیجئے۔ ہوسکے تو دوسری اشاعت میں اضافہ کردیجئے گا۔

پدم کمار صاحب سے سلام شوق کہیئے۔ وہ تو کبھی خط بھی نہیں لکھتے۔

مرسلہ
لطیف الدین احمد

علی گڑھ، ۱۴ اپریل ۵۸ء

مکرمی، تسلیم

خط ملا۔ شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا، بہت اچھا عنوان ہے۔ لکھنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ مگر فرصت کہاں سے لاؤں۔ پچاس ساٹھ صفحے کا مضمون لکھنا تو میرے بس کی بات نہیں۔ ہاں اگر بیس پچیس صفحوں کا مضمون آپ کافی سمجھیں تو آخر جون تک لکھ دوں گا۔

خورشید الاسلام کا مجموعہ پریس میں پڑا ہوا تھا۔ اب چھپ رہا ہے۔ غالباً دو مہینے میں شائع ہو جائیگا۔ اس پر انہوں نے نظر ثانی بھی کی ہے اور کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔

اصغر گونڈوی پر علیحدہ کوئی مضمون میں نے نہیں لکھا۔ یوں دوسرے شعراء کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ ایک دفعہ جامعہ کیلئے ایک مختصر مضمون لکھا تھا مگر وہ انہوں نے نہ جانے کہاں غائب کر دیا! امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے۔

مخلص
آل احمد سرور

۳۱ مئی ۵۸ء

مکرمی جنید صاحب،

آپ سے اتنی ندامت ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ آپکے خط برابر آتے رہے

چاہتا تھا کہ مضمون لکھ کر کسی طرح بھیج دوں۔ وعدوں اور بہانوں سے کب تک کام چلے گا۔ مضمون پہلے تو آسان نظر آیا مگر لکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ کتنا مشکل ہے۔ ادھر حال یہ ہے کہ دنیا بھر کی حماقتوں میں گھرا ہوا ہوں اور ان حماقتوں کو سعادت سمجھنے کی کوشش میں مصروف۔ یونیورسٹی میں تدریسی کاموں کے علاوہ انتظامی کام، انجمن کے مسائل، اپنی ریسرچ اور دنیا بھر کی بیگار، غرض جس عالم میں ہوں، میں ہی جانتا ہوں۔

آپ کا میری وجہ سے بڑا حرج ہوا۔ اس کی تلافی کیسے کروں۔ ایک حقیر سی صورت یہ ہے کہ یہ مضمون یونہی آپ کی نذر۔ آپ نے پہلے پچاس روپے دیئے تھے وہ بھی واپس کر دوں گا۔

اب آپ چاہیں تو اسے چھاپیں یا واپس کر دیں۔ بہرحال میں نے ضمیر کی خلش کو مٹانے کی کچھ کوشش کی ہے۔ میں نے میرا علاج جو احساس تھا اُسے قلم بند کر دیا ہے۔ کاپی پڑھنے میں وقت ہو تو کسی ایسے شخص کو دکھا لیجیے جو میرے خط سے واقف ہو۔ مثلاً بیدی یا باقر ہوں۔

مضمون کی رسید اور اپنی خیریت سے مطلع فرمایئے۔

مخلص

آل احمد سرور

۱۶ر جولائی ۵۷ء

مکرمی، تسلیم۔

آپ کا خط۔ جواب میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ میں انجمن کی کانفرنس

کے انتظامات میں مصروف تھا۔ شکر ہے کہ اچھا اور نمائندہ اجتماع ہو گیا۔
مضمون آخر جولائی تک بھیج دوں گا۔ کتاب کا نام واقعی لمبا ہے۔
انگریزی طرز ناپسند نہ ہو تو صرف "میں ان سے متاثر ہوا" عنوان برا نہیں۔
آپ کی تجویز اچھی ہے مگر مناسب تنظیم اور وسائل کی ضرورت ہے۔
پریس کے تحت اس سے اور کتابیں شائع کرنے کے بجائے پہلے ایک ادارہ ایسا قائم کیجیے جس کے کچھ وسائل ہوں۔ وسائل بڑھنے پر پریس بھی ضرور قائم کیجیے۔ پریس کا کام علیحدہ تنظیم چاہتا ہے۔ دونوں کام کرنے کے لئے بہت سے کارکنوں کی ضرورت ہو گی۔ اگر آپ ایک کوآپریٹو ادارہ قائم کر کے مطبوعات کا کچھ سلسلہ شروع کرا سکیں تو اچھا ہے۔ بمبئی میں وسائل فراہم ہو سکتے ہیں۔ سردار سے ضرور مشورہ کیجیے۔ وہ بہت مفید ہوں گے۔
جگر پر مضمون میں لکھ سکتا ہوں، ابوالکلام پر بھی لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر میری رائے عام رائے سے مختلف ہے اور شاید موجودہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ پھر اِدھر فرصت بھی نہیں ہے۔ خیر اس کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص
آل احمد سرور

کروڑی مل کالج، دہلی نمبر ۸، ۹ ستمبر ۱۹۵۸ء

مشفق اور عزیز من،

اس یادآوری کا ممنون ہوں۔ گذشتہ برسوں میں میں نے جانے کتنی بار آپکو یاد کیا بلکہ آپ کے مجھے خانگی حالات کی تلاش بھی اور مایوسی ہوئی۔

آپ نے مجھے اپنی اہلیہ سے متعارف کرادیا تھا اور ایک چھوٹی بہن سے۔ اب آپ صاحب عیال ہونگے۔ اس کے بارے میں آپنے ایک حرف نہ لکھا۔ مجھے کاروباری باتوں کے علاوہ ان امور سے بھی دلچسپی تھی۔

میں کسی قدر کالج کے درس تدریس میں مصروف رہتا ہوں لیکن آپکی فرمائشات کے لئے فرصت لازماً نکالونگا۔ میں نے سردار کو لکھا ہے کہ میں دسمبر کے شمارہ کے لئے نگاہ میں ایک مضمون "مولود" یا میلادناموں کے ماخذ پر لکھنا چاہتا ہوں اس لئے کہ میں اس دلچسپ نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میلاد کا رواج سیرۃ نبوی کی بجائے گوتم بدھ کے میلاد سے ماخوذ ہے۔ یہ آپ کی ادارہ پالسی کے خلاف تو نہ ہوگا؟ آپ نے شخصیات اور واقعات کے مجموعہ کے لئے مجھ سے پیش لفظ کی فرمائش کی ہے۔ اِس قسم کے مضامین دراصل انفرادی نفسیات اور شخصیت سے متعلق ہیں اور ایسا پیش لفظ میری سمجھ میں نہیں آتا جو اتنے بزرگوں کے رجحانات پر حاوی ہو۔ پھر میں نہ شاعر نہ افسانہ نگار نہ نقاد۔ مجھ سے دلخواہ مضمون نہ لکھا جائے گا۔ آپ چاہیں تو میں خود اس موضوع پر اپنے واردات لکھ دوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے آپ کا خط پڑھنے کے بعد اپنی زندگی پر نگاہ ڈالی تو مجھے محسوس ہوا کہ اب تقریباً ۴۵ برس کی باہوش زندگی انہیں واقعات و شخصیات   اِس میں تحریکیں، ہنگامے اور خود فریبیاں ہی ہیں۔ کیوں نہ میں انہیں قلمبند کردوں۔ یعنی اگر کوئی قسط وار شائع کردے یا کتابی صورت میں۔ اتنی فرصت آئندہ چند ماہ میں نہیں ہے کہ مستقل کتاب لکھوں۔ مضمون کی صورت میں ہر ماہ لکھ سکتا ہوں۔ بہر نوع آپ کے اس مجموعہ کے لئے میں چند صفحے لکھ سکتا

ہوں۔ آپ سوچئے اور مجھے لکھ دیجئے۔ اور معاوضہ کی بحث بے محل ہے۔
میں ستمبر کی ۱۰ سے ۲ اکتوبر تک علی گڑھ میں کچھ مطالعہ کے سلسلہ میں رہوں گا۔
علی گڑھ کا پتہ۔ معرفت ڈاکٹر منیب الرحمن صاحب، گل رعنا۔ سول لائن۔ ہوگا۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت۔ عصمت، شاہد اور جملہ احباب بخیر و عافیت ہوں گے!

نیاز کیش
محمد اشرف

۶ اکتوبر ۵۷ء

میرے شفیق و کرم فرما۔

میں علی گڑھ میں اس درجہ مصروف رہا کہ آپ کے گرامی نامہ کا جواب نہ دے سکا۔ البتہ میرا ارادہ ہے کہ میں آپ کے لئے شخصیات اور واقعات پر اور نگاہ کے لئے میلاد شریف یا اسلام و جمہوریت پر مضمون لکھوں۔ یہ اکتوبر کے مہینہ میں ممکن نہیں ہے اس لئے کہ مجھے بعض پرانے "قرضے" ادا کرنا ہے البتہ نومبر میں کوشش کرونگا۔ اور غالباً آپ کو مہینہ کے آخر تک لکھ کر ایک مضمون ضرور بھیج دوں گا۔ دوسرا دسمبر میں۔ میں نے یہ لائحہ عمل بنایا ہے۔

میں اپنی زندگی کے سیاسی اور سماجی تاثرات بھی قلمبند کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اسکی فرصت اس تعلیمی سال میں نہ مل سکے گی۔ اس لئے کہ میں آزاد کتاب گھر سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ پر ایک مختصر سی کتاب لکھ کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور اُسے پورا کرنا ہے۔ البتہ آئندہ سال میں کروں گا۔

ایک منصوبہ اور بھی ہے۔ مگر ابھی خیال ہے یعنی میں ہندوستان کی اسلامی سیاست پر ایک لکچر کا سلسلہ شروع کرنا چاہتا ہوں اور اگر کوئی جماعت مجھے

دعوت دے تو غالباً آئندہ سال مرتب کر لوں۔ بہر نوع یار زندہ صحبت باقی۔ کافی وقت ہے۔ میں آئندہ ماہ میں البتہ دو تین لیکچر یہاں (Extension Lecture) میں اس موضوع پر دے رہا ہوں۔ مجھے آپ کی بیگم بھی اور دعوت ابتک یاد ہے۔ میرا سلام بلکہ پیار اُن سے کہہ دیجئے۔

نیاز کیش

محمد اشرف

۱۴ نومبر ۱۹۵۷ء

مکرمی،

آپ کا منی آرڈر ملا۔ اور میں بڑے شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ قبول نہ کرنا آپ کی محبت کی توہین تھی۔ قبول کرنا ایک ذمہ داری سر لینا ہے اور میں ایک دو ہفتے اس سے بچنا چاہتا تھا۔ ہندستان میں یہ پہلا حادثہ ہے کہ کوئی مضمون کا معاوضہ دے اور بے لکھے۔ غالباً یہ تجربہ بھی آخری ہوگا۔ میں نوازشوں کا اتنا کم عادی ہوں کہ ان سے پریشان ہو جاتا ہوں۔ بہر نوع صورت یہ ہے کہ میں مضمون یقینی لکھنا چاہتا ہوں صرف مہلت کا سوال ہے اور دہلی جیسے شہر کی نوکری میں یہ فرصت کم نصیب ہوتی ہے۔ اکتوبر میں کافی وقت اکتوبر انقلاب کی سالگرہ کی نذر ہوا۔ اور مجھے اس سلسلہ میں تقریر دن مضمون پیام وغیرہ سے سابقہ پڑا۔ لطف یہ کہ یہ بیگاریں خوشگوار معلوم ہوتی ہیں کالج کے کام سے بہ مشکل دو تین گھنٹے روزانہ نکلتے ہیں۔ آئندہ دو ہفتوں میں یہاں کی یونیورسٹی کے ۴ لیکچر (Extension Lecture) شہر میں دینا ہیں۔ ۲ لیکچر "مسلم سوال" پر چیتم ہاؤس یعنی (Institute of International

Relations) میں - ایک کتاب پر ریڈیو - ایک مضمون انشین افریکن جرنل کو ـــــــــــ یعنی یہ قرضے چکانے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا مضمون اندیا یک علی گڑھ میگزین کے لئے! میں نے آپ کی کتاب کے مضمون کے لئے خاکہ بنا لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں دسمبر کے وسط میں آپکو بھیج دونگا۔ اس کے بعد دو ہفتے کے لئے علی گڑھ جاؤنگا یعنی ۱۳ دسمبر سے ۱ جنوری اور کچھ فارسی عربی کے مخطوطات پڑھ ڈونگا۔ سر دست یہ منصوبہ ہے اور موسم چونکہ خوشگوار ہے پورا ہو جائے گا میرے ذہن میں بعض دوسرے مضامین بھی ہیں مگر ان کا نمبر علی گڑھ سے واپس پر آئے گا۔ البتہ یہ ارادہ ضرور ہے کہ کسی اور وعدہ میں مبتلا ہوں۔

آپ نے میرے "صاحبزادوں" کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ بڑے میاں جاوید اشرف حال میں مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۶۷ء میں داخل ہوئے ہیں۔ اور اچھے طالب علم سمجھے جاتے ہیں گو کافی وقت اُن کا "نیم سیاسی" مصروفیتوں کی نذر ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹے شکیب سخت بد شوق ہیں۔ اس لئے میں نے اُنہیں ایک کارخانہ میں کام سیکھنے کے لئے چھوٹے بھائی کے پاس ریاست حیدرآباد (یعنی) میں بھیج دیا ہے۔ ایک کی موت کا آپ کو علم ہو گا۔ وہ بمبئی میں مدفون ہیں۔ باقی اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ آپ نے اپنے بارے میں نہیں لکھا۔ یعنی ذرا تفصیل سے۔ میرا خیال ہے اس کا موقع کبھی ذاتی ملاقات پر آئے گا۔ میں دہلی سے باہر جانا آنا چاہتا ہوں مگر کچھ لکھنے پڑھنے کی ہوس ایسی دامنگیر ہے کہ جی نہیں مانتا۔ جوانی کی زندگی غیر علمی کاموں میں گزارنے کے بعد اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں مگر مشکل ہے وہ ممکن ہے

دیکھئے۔ دعا کیجئے۔ جی ملنے کو ضرور چاہتا ہے۔ آپ اپنی مطبوعات میرے پاس ضرور بھیجتے رہیں۔ فہرست کتب کا شکریہ۔ بیگم صاحب کو سلام۔

نیاز کیش
محمد اشرف

۹ر جون ۵۸ء

بھائی، یہ قطعاً صحیح کہ میری نیت بمبئی آنے کی تھی اور ہے مگر فیصلہ کیفی صاحب کے لکچروں کے پروگرام پر تھا۔ مگر وہ شاعر آدمی ہیں اور دنیا بھر میں اُن کی مانگ رہتی ہے۔ غالباً ملاقات کے بعد یعنی گھر سے نکلتے ہی بھول گئے۔ چنانچہ وعدہ کے باوجود میں دوسرے دن کیفی صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ فوٹو اس وقت میرے پاس کوئی نہیں ہے۔ مگر بیوی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے کیمرہ سے لیکر ہفتہ بھر میں دے دینگی۔ یہ سنکر خوشی ہوئی کہ کتاب واقعی شائع ہونیوالی ہے۔ میں نے اپنی کالج کے ایک رفیق سے وعدہ کر لیا ہے کہ سال رواں میں میں اپنی سرگذشت بیان کرنا اور وہ لکھنا شروع کردیں وطن کی قلب ماہیت ایسی ہے کہ یہ دلچسپ ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی یاد کر لیا کیجئے۔

ہاں بیگم جنید اور بچوں کو پیار۔

آپ کا نیاز کیش
اشرف

۱۱ر جون ۵۸ء

ڈیئر جنید،

اتفاق سے ۴۵ سال پہلے کی ایک تصویر بیوی کے پاس نکل آئی۔ حاضر ہے۔ میں خط ڈالنے والا ہی تھا کہ آپ کا دوسرا خط موصول ہوا۔ کیا مجھے آپ کو یقین دلانے کی ضرورت ہے کہ میں آپ کا مطیع نہ سہی تو بھی تابع فرمان

ضرور ہوں۔ اسوقت میں کالج کے اور اپنے کاموں میں ایسا گھرا ہوں کہ انتہائی کوشش کے باوجود دو سال پہلے کا مضمون اور کتاب لکھنے کا وعدہ پورا نہ کرسکا۔ اگر کبھی کیفی مجھے واپسی سے پہلے "پابند" کرلیتے تو شاید دو تین دن کے لئے آجاتا۔ اسوقت ناممکن ہے۔ بہر نوع "یار زندہ صحبت باقی" ابھی زندگی ہے اور ملاقات ہوگی۔ اہلیہ کی جانب سے بھی آپ کی دعوت کا شکریہ۔ آپ اطمینان رکھیں مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میرے لئے عین مسرت ہوگا کہ میں آپ کے پاس فروکش ہوسکوں۔ تصویر پسند نہو تو دوسری کھچوا کر بھیجدوں مگر ہفتہ بھر ضائع ہوجائیگا۔

نیاز کیش

اشرف

۴۳۔اے، ہنومان روڈ، نیو دہلی، ۱۴؍ جون ۱۹۵۲ء

مکرمی، تسلیم!

آپکی فرمائش کے مطابق جو کچھ سوجھا لکھا کر بھیج رہا ہوں۔ رسید سے مطلع فرمائیں۔

کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ یہ چیزیں اگر ہندی میں بھی نکل جائے تو اچھا ہے۔ اس لئے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ جو چھپوائیں اس کے دو تین پروف یا ری پرنٹ مجھے بھجوادیں تو میں اُسے ہندی بھی کرالوں۔ آپ کے یہاں چھپنے کے بعد ہندی میں بھی چھپ جائے۔ جیسی آپکی رائے ہو۔

آپ کا خادم،

سُندرلال

لکھنؤ، ۲۰ر فروری ۵۰ء

تسلیم - کس عنوان پر مجھے لکھنا ہے، میں بھول گیا۔ پھر لکھ دیجئے۔

نیاز

۲ر مارچ ۵۰ء

جناب من، گرامی نامہ پہونچا - میں لکھونگا لیکن "۵۰-۶۰ صفحات کی تعیین اور پچاس کے دی پی" نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ لکھوں یا نہ لکھوں۔ میری رائے میں معاوضہ کے خیال کو ترک کر دیجئے گو بہت ہے اور اس کے ساتھ ۵۰، ۶۰ صفحات کی تعیین بھی ختم ہونا چاہیئے۔

آپ کا
نیاز

۳ر اپریل ۵۰ء

تسلیم - میں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ صفحات (فلسکیپ سائز کے) لکھونگا۔ لیکن دی پی کا طریقہ مجھے پسند نہیں۔ آپ منی آرڈر ۵۰ بھیجدیجئے۔

آپ کا
نیاز

۸ر مئی ۵۰ء

تسلیم - خط مل گیا۔ شکریہ - میرے پاس تصویر کا بلاک نہیں ورنہ ضرور بھیجدیتا۔

نیاز

۵ر جون ۵۰ء

مکرمی، بلاک تو کوئی نہیں ہے البتہ تازہ تصویر بھیجدوں گا۔ یہاں گرمی بے پناہ ہے۔ مجدد کا تبادلہ دہلی ہو گیا تھا۔ لیکن اب

غالباً وہ پھر یہاں آجائیں گے۔

آپ کا
نیاز

لکھنؤ، ۱۳جولائی ۱۹۵۷ء

تسلیم۔ حد درجہ شرمسار ہوں کہ ابتک تعمیل ارشاد نہ کر سکا۔ اس دوران میں علیل ہوگیا۔ اور ابتک سلسلہ جاری ہے۔ موسم خوشگوار ہو تو شاید جان میں جان آئے۔ میں کوشش کرونگا۔ کہ جولائی میں اپنا وعدہ پورا کرسکوں فراق اور جگر پر کوئی نیا مضمون لکھنا تو مشکل ہے۔ آپ چاہیں تو مطبوعہ مضامین لے سکتے ہیں۔

آپ کا
نیاز

۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء

تسلیم۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ بمبئی آنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ لیکن آؤں کیسے؟ یہاں کے کے کر رکھا ہے۔ آپ کا مضمون میں نے لکھنا تو شروع کر دیا ہے لیکن سوال "بر پایاں کہ رساند؟" کا ہے۔ آپکی دعوت کا مکرر شکریہ۔

آپ کا
نیاز

۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء

مکرمی، تسلیم۔

میں آج ہی علی گڑھ سے واپس آیا ہوں۔ آپ کا خط ملا شکریہ۔ آپ دہلی تشریف لے جائیں۔ میں اب بمبئی اسوقت آؤنگا جب آپ دہلی سے واپس آجائینگے۔ نگار کی وہ پرانی کاپیاں جن میں جگر اور فراق پر مضامین شامل ہیں

ہیں ملنے مشکل ہیں۔ کوشش کرونگا یا اُن مضامین کی نقل کراکر بھیجوں گا۔ مگر یہ کام ذرا دیر طلب ہے۔ میری صحت اب نسبتاً بہتر ہے۔

آپ کا
نیاز

۱۲؍ ستمبر ۵۷ء

مکرمی، تسلیم۔

خط ملا۔ اس وقت تک لیٹے لیٹے جو کچھ لکھ چکا ہوں وہ بھیج رہا ہوں۔ جو اکثر جگہ مشکوک ہیں صاف کرنا میرے امکان میں نہیں اندہ ہو بھی تو کافی ہے۔ اور آپکو مسودہ جلد از جلد پہنچ جانا چاہیئے۔ اس کے آگے جو کچھ لکھنا ہے وہ بھی بہت جلد بھیج دونگا۔ کیا کروں علالت و اضمحال نے بیکار کر رکھا ہے۔ آپ خود اسکو دیکھکر جہاں ضرورت ترمیم و اصلاح کی ہو کر دیجئے۔ تکلیف تو ہوگی۔

آپ کا
نیاز

وزیر منزل، وزیر حسن روڈ، لکھنؤ
۱۸؍ اپریل ۵۸ء

بھائی جنید۔

تمہارے خط ملے اور کل پچاس روپیوں کا منی آرڈر بھی ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک ہفتے میں شخصیتوں والا مضمون لکھکر تمہیں بھجدوں۔ لیکن مجھے فوراً ایک ادیبوں کا ڈیلی گیشن میں مشرقی جرمنی جانا پڑ رہا ہے۔ ۹ مئی کو (غالباً) بمبئی سے ہی روانہ ہونگا۔ اور غالباً جون کے وسط تک واپس آجاؤنگا۔ تو پھر اب تو واپس آنے کے بعد ہی مضمون تم کو دے سکونگا، یعنی جولائی کے وسط یا شروع تک۔ معاف کرنا۔

رہا پکچروں کا معاملہ۔ بہتر یہ ہے کہ میں فرانسیسی ادب پر ہی پکچر دوں۔

انگریزی اور ایرانی ادب پر لیکچر دینے کے لئے مجھ سے بہتر لوگ تم کو مل سکتے ہیں۔ فارسی ادب پر منیب الرحمٰن (علی گڑھ یونیورسٹی) بہت اچھے رہیں گے۔ حال میں ان کی ایک کتاب بھی جدید ایرانی شاعری پر شائع ہوئی ہے جو اچھی ہے۔
میرا خیال ہے کہ جولائی کے آخر یا اگست میں ان لیکچروں کے لئے بمبئی آ سکوں گا۔ اس وقت تک انہیں لکھ بھی لوں گا۔

انگریزی ادب پر لیکچر دینے کے لئے میں دو نام تجویز کرتا ہوں۔ ایک سلامت اللہ خان صاحب ہیں۔ یہ انگریزی کے لیکچرر ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں۔ حال میں ان کا مقالہ انگریزی آزاد نظم پر علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا ہے۔ یہ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کے (علی گڑھ) سالانہ جلسے میں پڑھا تھا۔ میں نے بھی سنا تھا۔ تم ان سے کہو۔ نوجوان آدمی ہیں اور انگریزی ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ یا پھر محمود حسین صاحب ہیں۔ یہ بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے انگریزی کے ریڈر رہ چکے ہیں۔ اور آج کل وہاں یونیورسٹی کے رجسٹرار ہیں۔ یہ لوگ اردو بھی اچھی جانتے ہیں۔ اور عمدہ مقالے لکھیں گے۔

جرمنی اور روسی اور امریکی ادب پر بھی لیکچر ہوں تو اچھا ہے۔ اور پھر چینی اور جاپانی ادب پر۔ اگر ہو سکے تو اس کے لئے میں نام تجویز کروں۔
میں غالباً ۲ ریا ۳ رتک بمبئی پہونچوں گا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند سے دریافت کر لینا۔ اُن کو میرا پتہ اور آنے کا وقت معلوم ہو گا۔ ملنا ضرور۔
سب دوستوں کو سلام۔

تمہارا
سجاد ظہیر

۴؍۱۰ آصف علی روڈ، دہلی، ۱۴؍فروری ۵۸ء

عزیزم جنید، تم سے بڑی شرمندگی ہے کہ تم کو ابھی تک اپنا مقالہ نہیں بھیجا۔ لیکن اس ہفتے ضرور اُسے مکمل کرونگا۔ اور دس دن کے اندر یعنی ۲۴؍فروری تک تو مل جائے گا۔ تم اردو کانفرنس میں

اور یہاں ۲۰؍ تک رہونگا۔ یہیں تمہارے لئے مقالہ لکھوں گا۔ اور بھیجوں گا۔

تمہارا۔ سجاد ظہیر

۱۵؍مئی ۵۸ء

عزیزم جنید۔ تمہارا پوسٹ کارڈ چار دن ہوئے ملا۔ یوںبھی آخر کار تمہارا کام ختم ہی ہو گیا۔ اسوقت میرے مضمون کی نقل ہو رہی ہے۔ کل ختم ہو گی اور تم کو بذریعہ وی پی (پچاس روپیہ) روانہ کر دی جائے گی۔ رسید سے مطلع کرنا اور پڑھ کر بتانا کہ مضمون تم کو کیسا لگا۔ ابتو میں یہ سوچتا ہوں کہ اس سلسلے کو جاری رکھوں اور پوری کتاب تیار کر لوں۔ تم شائع کرو گے؟

تمہارا۔ سجاد ظہیر

۲۷؍مئی ۵۸ء

عزیزم جنید۔ تمہارا ۲۴؍ کا کارڈ ملا جس میں میرے مسودے کے پہنچنے کی رسید تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ میرا مضمون دراصل میری داستان کی ابتدا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب لکھنا شروع کیا تو اس کا خیال نہیں رکھا کہ پچیس تیس صفحوں میں پوری داستان بیان کرنی ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ اگر اسی پیمانے پر لکھوں تو کم از کم ڈیڑھ دو سو صفحوں کی ضرورت ہو گی۔ جو ممکن نہیں۔ آٹھ دس صفحے لکھنے کے کوئی معنی نہ ہونگے۔

اس لئے بھائی اسی پر اکتفا کرو۔

البتہ، میرا ارادہ ہے کہ اس داستان کو مکمل کروں۔ جو غالباً چھ مہینے کے اندر ہو جائے گا۔ شروع کا حصہ بھی کافی بڑھاؤں گا اور بدلوں گا۔ اور پاکستان سے واپسی تک کی باتیں لکھوں گا۔ جو بالکل ایک الگ کتاب ہوگی۔ اگر تم چاہوگے تو تم سے ہی اسکی اشاعت کا معاملہ ہو سکے گا۔

اچھا اب یہ بتاؤ کہ موجودہ مجموعہ کب شائع ہوگا اور تم نے کس کس سے لکھوایا ہے۔ یہ بھی تو معلوم ہو کہ میرے ساتھی کون کون بزرگ ہیں؟

امید ہے کہ اچھے ہوںگے۔

تمہارا۔ سجاد ظہیر

کوڈور لاج، ۴، بنگلوز، اندھیری، بمبئی۔

۸ اپریل ۵۷ء۔

محترمی جنید صاحب، آداب۔ آپ کا خط مل گیا۔ کیا بتاؤں ان دنوں بے حد مصروف ہوں۔ اگر آپ جولائی تک مسودوں کی وصولی کی تاریخ بڑھادیں تو میں جولائی کے وسط تک آپکی خدمت میں وہ مضمون حاضر کر سکتا ہوں۔ مئی اور جون کے مہینوں میں تو قطعی ناممکن ہے۔ جولائی میں البتہ ضرور کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں سے اگر آپ مجھے جون کے آخر سے پریشان کرنا شروع کرینگے تو بہت اچھا رہے گا۔

آپ کا
کرشن چندر

اور کون کون لوگ اس سلسلے میں لکھ رہے ہیں؟

کوُدر لاج، ۴۴، بنگلوز، اندھیری، بمبئی
۱۴ر جون سنہ ۵۷ء

محترمی جنید صاحب،

آداب۔ آپ کا خط ملا۔ میں مسودہ کسی صورت میں وسط جولائی سے
پہلے نہ لکھ سکوں گا۔ آپ اسی حساب سے اُس کی اشاعت کا بندوبست کیجئے۔
آپ پر مجھے منی آرڈر بھیج سکتے ہیں۔

آپ کا مخلص
کرشن چندر

۷ر اکتوبر سنہ ۵۷ء

محترمی جنید صاحب، تسلیمات۔

آپ کے دونوں خط میری عدم موجودگی میں آئے۔ میں کلکتہ گیا ہوا تھا۔
چند دن ہوئے بخار میں واپس لوٹا ہوں۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔ Temprature
صرف ۱۰۵ ڈگری تھا۔ اِس صورت میں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری کیفیت
کیا ہوگی۔ اب کچھ آرام محسوس کر رہا ہوں۔ لہٰذا بستر علالت سے فرصت پانے کے
بعد پہلی فرصت آپ ہی کی نذر کی جائیگی۔ اطمینان رکھیئے۔ آپ کا کام ہو جائیگا۔
باقی خیریت، حاضرینِ محفل کے آداب۔

کرشن چندر

۲ر نومبر سنہ ۵۷ء

محترمی جنید صاحب، آداب۔

آپ مشکل سے یقین کرینگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اکتوبر کا پورا مہینہ علالت
میں گزر گیا۔ مشکل سے دو چار روز صحت نسبتاً بہتر رہی۔ یہ خط میں بستر علالت
سے لکھ رہا ہوں۔ مگر آج ٹمپریچر ۹۹ ہے۔ اور ڈاکٹروں کا خیال ہے۔ کہ دو
تین روز میں کام کرنیکے لائق ہو جاؤنگا۔ اگر آپ مزید ایک ہفتہ انتظار کر سکیں تو مجھے

ایک ہفتے کی مزید مہلت دیجئے۔ اور اگر نہ ہو سکے تو مجھے مطلع کر دیجئے۔ میں آپ
کے پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر واپس بھیج دونگا۔ اور کسی دن خود آ کر آپ سے
معافی کا خواستگار ہونگا۔ کہ میری وجہ سے آپکو اسقدر تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔
اپنے خط میں ذرا اپنا مفصل پتہ لکھیئے۔ اور یہ بھی بتایئے۔ کہ آپ اکثر
اپنے پتے پر کس وقت بالعموم ملتے ہیں اور یہ جگہ کہاں پر ہے؟ میں خود ہی کسی
روز آ کے آپ سے مل لونگا۔ امید ہے آپ مع الخیر ہونگے۔

معذرت کے ساتھ
آپ کا۔ کرشن چندر

۱۸ر جنوری ۱۹۵۰ء

محترمی جنید صاحب، آداب۔

میں ایک ضروری کام کے سلسلہ میں دہلی گیا تھا۔ اور آج تین دن ہوئے
دہلی سے واپس آیا ہوں۔ اس لئے نہ تو آپ کا خط کا جواب دے سکا اور نہ ہی مضمون
کے متعلق لکھ سکا۔ اب مضمون کو چونکہ لکھے ہوئے کافی عرصہ گذر چکا ہے اور اُس کا
مسودہ کم و بیشتر میرے ذہن سے صاف ہو چکا ہے۔ اس لئے درخواست ہے کہ
مضمون کی ایک کاپی واپسی ڈاک ارسال فرمائیں تاکہ ایک بار پڑھ لوں اور آپ کے
حسب منشا بڑھا کر لکھ دوں۔ مضمون واپسی ڈاک ارسال فرمائیں کیونکہ لکھنے
میں کم و بیشتر دس دن درکار ہونگے۔ باقی خیریت ہے۔ امید ہے آپ معہ
اہل و عیال بخیریت ہونگے۔ کاپی فوراً بھجدیں۔ مضمون آپ کو دس دن کے اندر
ضرور روانہ کر دیا جائے گا۔

آپ کا مخلص
کرشن چندر۔

فیلومینا لاج، چرچ روڈ، جوہو، بمبئی نمبر ۲۳
۱۳/ مارچ ۱۹۵۸ء

برادرم۔ پرانے کام کا اتنا بقایا پڑا ہوا ہے کہ "شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا" جیسے جامع مضمون پر لکھنا فی الحال ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال آپ سے کبھی ملاقات ہو تو اس کتاب کے بارے میں مفصل بات کرنی چاہیئے

اُمید ہے آپ کا اشاعتی پروگرام کامیاب ثابت ہوگا۔

احمد عباس

۱۱/ اپریل ۱۹۵۸ء

برادرم۔ آپ کا مضمون تیار ہے لیکن وی پی سے بھیجنا معیوب معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب اور آپ کے اشاعتی پروگرام کے بارے میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر آپ ہفتے کے دن (Sunday) صبح سویرے یہاں تشریف لائیں تو کارآمد بات چیت ہو سکتی ہے۔ اور آپ مضمون بھی خود لے جا سکتے ہیں۔

تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔

آپ کا خادم
خواجہ احمد عباس

پاکستان، ۱۰/ جنوری ۱۹۵۸ء

کرم گستر، وعلیکم السلام

پنجاب یونیورسٹی کی دعوت پر ۱ ہفتہ کے لیے لاہور آیا ہوا تھا۔ اب پرسوں یہاں سے واپس ہو کر کل ایک ہفتہ کے اندر مدراس یونیورسٹی کی دعوت پر مدراس روانہ ہو جانا ہے۔ ایک ہفتے کے قیام کے بعد حیدرآباد ان شاءاللہ پہلے ہفتہ فروری میں وطن پہنچ جاؤں گا۔

آپ ایک یاددہانی کا خط مجھے شروع فروری میں ضرور لکھ دیں۔ کچھ نہ

کچھ تعمیل ارشاد تو ہو ہی جائیگی۔

اگر آپ نے صفحات وغیرہ کا اندازہ اپنی فرمائش کے ساتھ ہی لکھ دیا ہوتا تو اس غلط فہمی کی نوبت نہ آتی۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ جتنا سادہ کاغذ آپ نے لفافہ کے اندر رکھ دیا تھا، بس اسی پر جواب آنا چاہیئے۔ اور میں نے اس سے زیادہ ہی لکھکر بھیجدیا۔ والسلام۔

دعاگو
عبدالماجد

بمبئی، ۱۴ مارچ ۵۸ء

برادرم جنید صاحب، تسلیم۔

کل شام کو آپ کا خط ملا۔ پرسوں رات کو سلطانہ نے بھی کچھ اسی قسم کا ذکر کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ گذشتہ ایک ماہ سے میں بعض احباب کے ساتھ مل کر ایک ادبی رسالے کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور آج کل اس کے لئے روپیہ جمع کرنے اور مضامین وغیرہ فراہم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بس آپ کے پبلشنگ ہاؤس اور اپنے رسالہ دونوں کے سلسلے میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت بے انتہا مصروف ہوں۔ اس لئے خود نہ آسکوں گا۔ آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ آج شام کو یا رات کو (دیر بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے) آجایئے تو باتیں کر ڈالیں۔

آپ کا
سردار جعفری

۲۵ جون ۵۸ء

برادرم جنید صاحب، تسلیم۔

آپ کا خط اور نئی کتابوں کا پروگرام ملا۔ شکریہ۔ میرے ذمہ جو مضمون ہے

ہ آخر جون یا شروع جولائی میں حاضر کر دونگا۔ لکھ چکا ہوں۔ ایک خط اور ڈالنا چاہتا ہوں۔ کسی نئے مضمون کا وعدہ فوراً نہیں کر سکتا۔ ایک ماہ بعد بتاؤں گا۔ اشاعت

سلسلے میں آپ کسی وقت زحمت کیجئے تو زبانی باتیں ہو جائیں۔ میں اس لئے جھجک رہا ہوں کہ آپ کا اور دوسرے احباب کا روپیہ پھنس نہ جائے۔ پھر بھی کسی وقت تشریف لے آیئے۔ میں عام طور سے صبح گیارہ بجے تک گھر رہتا ہوں۔ شام کو سات بجے کے بعد کا وقت بھی مناسب ہے۔ آنے سے پہلے ٹیلفون کر لیجئے تو بہتر ہے۔

(ٹیلفون نمبر ۲۰۱۹ - ۴۲)

آپ کا

سردار جعفری

فلک نوا، میرس روڈ، علی گڑھ

برادرم جُنید صاحب، تسلیم۔

میں گوالیار سے ہوتا ہوا یہاں آیا۔ آپ کی صحت کی طرف سے تشویش ہے۔ لکھیئے کہ اب آپ کیسے ہیں۔ آپ علاج کی طرف سے غفلت نہ کیجئے گا۔

یہاں اور گوالیار میں بمبئی کی طرح لوگوں کو "نگاہ" کا بڑا شدید انتظار ہے۔ بھوپال کے کچھ لوگ ملے تھے۔ وہ بھی پوچھ رہے تھے۔ میں نے یہاں آکر احباب سے مضامین وصول کر لئے ہیں۔ "دیوان غالب" کا تھوڑا سا کام ہے وہ کر کے بمبئی آؤں گا۔ تو نگاہ کی طباعت شروع ہو جائیگی۔ ہماری اشاعت کی تاریخ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر ہے۔ پریس اس ماہ کے آخر تک دیوان غالب کے کام سے اتنا فارغ ہو جائے گا کہ نگاہ کی طباعت شروع کر سکے۔ اس طرح وسط مارچ تک پرچہ تیار ہو جائے گا۔ آخر مارچ اور شروع اپریل میں آپ کے ساتھ مختلف مقامات کا دورہ کر کے روپیہ جمع کر سکتا ہوں۔

آپ کا

سردار جعفری

چھ سو کے قریب عنوانات، شعراء کی تعداد پانچسو سے زیادہ، ہر شاعر کی مختصر سوانح

حضرت مولانا آزاد مقدمے میں فرماتے ہیں "مجھے یہ دیکھکر نہایت مسرت ہوئی کہ سید بہاءالدین احمد صاحب نے ایک عرصے کی محنت اور جستجو کے بعد ایک ایسا مجموعہ شائع کرنیکی کوشش کی ہے..... انہوں نے اردو شاعری کے نظر و مطالعہ کی ایک نئی راہ کھولدی ہے۔ آئندہ اس رخ پر اصحاب ذوق نئے نئے قدم اٹھا سکیں گے۔..... میں کہہ سکتا ہوں کہ عنوانوں کے تجویز کرنے میں ہر طرح کے مواد و مطالب کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اور اشعار کا انتخاب بھی سلیقے کے ساتھ کیا گیا ہے......"

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار فرماتے ہیں "مجلد صورت میں یہ اور بھی اچھی لگتی ہے۔ یوں شعر و ں کے انتخاب کا معاملہ ہر شخص کے شخصی ذوق کا اتنا دابستہ ہے کہ مشکل ہی ہے کہ کوئی دو شخص ایک سا انتخاب کر سکتے ہیں... لیکن آپکی محنت کا پھل سب کیلئے قابل قدر ہے میں آپکو اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

جناب رشید احمد صدیقی صاحب صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ فرماتے ہیں "کتاب کے بیشتر [illegible] اشعار کے آپکے حسن طبیعت کا قائل ہونا پڑتا ہے ... میں یقین کے [illegible] ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اس نوعیت کی جتنی کتابیں [illegible] شائع ہوئی ہیں ان میں آپ کی یہ کتاب سب سے بہتر ہے [illegible] مجموعہ ہر حیثیت سے قابل تعریف ہے، اور آپ [illegible] قابل تہنیت۔"

جناب نیاز فتحپوری صاحب [illegible] نگار" میں فرماتے ہیں "اسمیں شک نہیں کہ یہ تالیف فاضل مصنف کے وسیع مطالعہ اور ذوقِ حسن کی بڑی قیمتی دستاویز ہے، یہ کتاب گویا تاریخ، تذکرہ و انتخاب کلام کا بڑا دلچسپ دامیزہ ہے جس کی ملک کو قدر کرنا چاہیئے۔ نہایت نفیس کاغذ۔ بہترین طباعت و کتابت۔

ماہنامہ "الکلام" بنگلور "اس مجموعہ کو نادر ولاجواب اردو اشعار کا ایک قابل قدر انسائکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔"

قیمت مجلد عنہ

ملنے کا پتہ:- گیان منزل پبلیکیشنز، دریاپور، پٹنہ ۴، بہار